رجسٹر نمبر ۱۔ ۴۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ار

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے
(معہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصّہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور وہان ماہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعاد توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات۔ کاغذ سفید و بیز
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن بیان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپکو نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حُسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ تحقیقاتی تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کسطرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو جرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مہربانی فرماکر — یہ پورا صفحہ پڑھ لیجئے

داہنی طرف نشان (✗) دیکھ لیجئے

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا چندہ مئی سنہ ۵۰ء میں ختم ہو گیا۔ اگر آپ ہندوستان میں ہیں تو آیندہ پرچہ ذریعہ وی، پی بھیجا جائے گا، لیکن اگر آپ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ اپنا چندہ چھ روپیہ (پاکستانی سکہ) ہمارے نمایندہ کو حسب ذیل پتہ سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کرکے ہم کو اطلاع دیجئے تاکہ نگار جاری رکھا جائے۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول - کراچی

پاکستان کے بہت سے خریدار

ایسے ہیں جن کا چندہ دسمبر سنہ ۴۹ء میں ختم ہو گیا تھا اسلئے سالنامہ ان کو نہیں مل سکا ہے، ان کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنا چندہ (چھ روپیہ پاکستانی سکہ) ہمارے نمایندہ کو حسب ذیل پتہ پر ذریعہ منی آرڈر بھیجکر ہم کو اطلاع دیدیں تاکہ خریداری جاری رکھی جائے اور سالنامہ سے لیکر اسوقت تک کے تمام پرچے انکو بھیجدئے جائیں گے۔ آیندہ جن کا چندہ ختم ہو وہ بھی ازراہ کرم اپنا چندہ اسی پتہ پر بھیجتے رہیں۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - متصل ہائی اسکول - کراچی

کراچی، لاہور اور راولپنڈی کے ایجنٹ صاحبان کو مطلع کیا جاتا ہے کہ

جب تک تبادلۂ زر کا مسئلہ طے نہ ہوگا، نگار کے پرچے اور ان کی طلب کی ہوئی کتابیں ان کو ہمارے نمایندوں کے ذریعہ سے پہونچیں گے - ازراہ کرم ان کی قیمت ادا کرکے کتابیں ان سے حسب ذیل پتہ پر وصول کر لیا کریں۔

نمایندہ لاہور	نمایندہ کراچی	نمایندہ راولپنڈی
حکیم اقبال حسن صاحب	ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی	قومی کتب خانہ چوک نیا بازار
متصل دربار داتا گنج بخش لاہور	۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول کراچی	راولپنڈی

پاکستان میں ہماری کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ

پاکستانی حضرات خواہ وہ ایجنٹ ہوں، یا نگار کے خریدار یا دوسرے کرمفرما ہماری کتابیں اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیجدیں ہم کتابیں ان کو ذریعہ رجسٹری بھیجدیں گے اور وہ ان کی قیمت ہمارے حسب ذیل نمایندوں میں سے کسی کو دست بدست دیدیں گے یا ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے - ۱ - ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - متصل ہائی اسکول - کراچی۔

۲ - حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور - ۳ - کتب خانہ چوک نیا بازار - راولپنڈی

جن بچوں کو
بڑا ہو کر اس دُنیا کا بوجھ اُٹھانا ہے
ان کی پرورش "نونہال" پر ہونی چاہیئے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانیوالا
ان کا دِل پسند ٹانک

حمدرد دواخانہ وقف دہلی

Hamdard

دنیائے مقویات میں ایک بےمثیل خاص ایجاد

برقی مرہم

ضعیف الاعصاب نازک طبع لوگوں کی مایوسی دور کرنے والا کمزور اعصاب میں فی الفور برقی لہر دوڑنے والی سہل الترکیب نہایت معطر اور زود اثر دوا ہے، جس کو اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے لوگ اکثر اپنے ہمراہ رکھتے ہیں اور مکمل ۱۴ یوم کے استعمال سے ہر قسم کی کمزوری اور ناکارہ پن دور ہو جاتا ہے، سوزش جلن وغیرہ کی تکالیف سے پاک ہے۔

قیمت مکمل کورس پانچ روپیہ آٹھ آنے۔ نمونہ ایک روپیہ آٹھ آنہ

محصول ہر حالت میں بہ ذمہ خریدار

مطب حکیم ظہیر الحسن (میونسپل کمشنر) متھرا (یو۔پی)

بال عمر بھر کے لئے سیاہ نکلیں گے

روح حیات میں نے بیحد تجربات اور کثیر روپیہ خرچ کرنے کے بعد یہ ایسی نادر دوا ایجاد کی ہے جس کے کھانے سے عمر بھر کے لئے تمام بال سیاہ نکلیں گے اور پھر کبھی سفید نہیں نکلیں گے یہ نہایت بیش قیمت دوا ہے ضرور استعمال کریں اور میرے تجربات کی داد دیں۔ یہ ممکن نہیں کہ اس کے استعمال کے بعد بال سفید نکلیں، خداوند عالم نے جڑی بوٹیوں میں عجیب و غریب اثرات پیدا کئے ہیں، جالینوس لقمان وغیرہ نے اپنی دو دو ہزار برس کی عمریں تجربہ ہی کرنے میں صرف کی تھیں۔ قیمت دس روپیہ (عشر)

اکسیر برص جسم میں سفید داغ ہو گئے ہوں اور کیسا ہی پرانا مرض پرورش کرتے کرتے پرانا ہو گیا ہو اور داغ خواہ کتنے ہی بڑے ہوں قطعی اس دوا سے صحت کاملہ ہو جاتی ہے اور پھر کبھی یہ مرض نہیں ابھرتا ہے نہایت اکسیر دوا ہے ضرور استعمال کریں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے تجربہ کود شاہد ہو جائے گا۔ قیمت تین روپیہ (دے۔)

(نوٹ) کارگر نہ ہو تو قیمت واپس، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوائیں نہایت مجرب ہیں میرا پیشہ خلق خدا کو نفع پہنچانا ہے، عام مشتہرین کی طرح لوٹنے کا نہیں ہے اب بھی اگر آپ محروم رہیں تو یہ آپ کی قسمت ہے

پتہ:- **حکیم ثابت علی**

(رئیس پنجرہ بان، خوش کلام عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر نمبر ۳ لکھنؤ (یو۔پی)

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندستانی جہازی کمپنی)

خاص حج سروس

مغل لاین نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ امسال رمضان المبارک سے پہلے زائرین بیت اللہ کے لئے جہازوں کی روانگی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ رمضان کے بعد جہازوں میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے جو مایوسی ہوتی ہے، اس کے پیشِ نظر عازمینِ حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مندرجۂ ذیل جہازوں کی روانگی سے فایدہ اُٹھائیں۔ ان جہازوں میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے جو مایوسی ہوتی ہے، اس کے پیشِ نظر عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مندرجۂ ذیل جہازوں کی روانگی سے فایدہ اُٹھائیں۔ ان جہازوں میں جگہ بھی کافی ہے اور ان کا کرایہ بھی رمضان کے بعد جانے والے جہازوں کے مقابلہ میں کم ہے۔ جو حضرات ان جہازوں سے سفر کرنا چاہتے ہوں وہ روانگی کی تاریخ سے کم از کم پانچ روز پہلے بمبئی ضرور پہونچ جائیں۔

ایس۔ ایس۔ "اکبر" — وزن ۴۰۴۷ ٹن

۲۰ر مئی ۱۹۵۰ء کے قریب بمبئی سے روانہ ہوگا

ایس۔ ایس۔ "جہانگیر" — وزن ۴۵۶۶ ٹن

۳۰ر مئی ۱۹۵۰ء کے قریب بمبئی سے روانہ ہوگا

قبلِ رمضان جہازوں کا **خاص رعایتی کرایہ** (معہ خوراک)

بمبئی تا جدہ واپسی

درجہ	اول	۱۱۰۵ روپے
عرشہ	(ڈیک)	۳۷۳ روپے

ان کرایوں میں قرنطینہ کا مران کی فیس، جدہ کے محاصلِ صفائی اور کشتی کا کرایہ شامل نہیں ہے، جنکی مجموعی رقم ۴، روپے ۱۲ آنے ہوتی ہے

ٹرنر مارریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

تار کا پتہ :- مینجنگ ایجنٹس :- **دی مغل لائن لمیٹڈ**

۱۶۔ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "من ویزداں" کے دونوں حصے
تیرہ روپیہ میں معہ محصول حاصل کر سکیں گے

ورنہ

غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے۔
کیونکہ اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور
آیندہ اتنی بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں ہے۔

"من ویزداں"

ایک صحیفۂ انسانیت ہے جس کے مطالعہ کے بغیر آپ
مذہب کی صحیح روح نہیں سمجھ سکتے۔ **منیجر نگار لکھنؤ**

ہندوستان میں "غزال" کی سول ایجنسی نگار کو

پاکستان کے ممتاز علمی و ادبی ماہنامہ "غزال" کراچی کی سول ایجنسی
ماہنامہ نگار لکھنؤ کو دیدی گئی ہے۔ ہندوستان میں جو حضرات غزال کے
سالانہ خریدار ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان کے جو حضرات غزال کی
ایجنسی لینا چاہیں وہ سالانہ چندہ یا مطلوبہ کاپیوں کی قیمت بعد
وضع کمیشن منیجر ماہنامہ نگار لکھنؤ کو بھجوا دیں اور رسید ڈاکخانہ دفتر
غزال میں روانہ کر دیں، رسید پہونچتے ہی غزال کی مطلوبہ تعداد
ان کو بذریعہ رجسٹری بھجوا دیجائے گی۔ منی آرڈر کوپن پر یہ وضاحت کرنا
ضروری ہے کہ یہ روپیہ غزل کے واسطے ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے
آٹھ آنے۔ قیمت فی کاپی پانچ آنہ۔ نیوز ایجنٹس کو کمیشن ۳۳ فی صدی۔

منیجر ماہنامہ غزال - ۹۔ بھگوان راجہ بلڈنگ
تیجا اسٹریٹ۔ رنچھور روڈ۔ کراچی

جلد کو صاف کرنے اور خوبصورتی کو بڑھانے کیلئے

صافی

استعمال کیجئے

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ۔ ہر جگہ بکتی ہے

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۷ | فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۵۶ء | شمار- ۵

ملاحظات ---------- ۵
ایک مستقبل کی تلاش ... مارس مینڈس (مترجم ل احمد اکبرآبادی) ۹
شبلی کا فارسی تغزل ... رشید حسن خاں شاہجہانپوری .. ۱۵
عربی حروف تہجی کا تلفظ ---- اسحٰق محمد ---- ۲۶
انیس کی مرثیہ نگاری ... مرزا جعفر علی خاں اثر --- ۳۱
اشتہارازی ... رشید احمد صدیقی ------ ۳۹
اشارات ---- خیر بہوری ------- ۴۴
باب المراسلۃ والمناظرہ ---- ۴۹
الٰہ وما علیہ ---------- ۵۷
کفن (نظم) ---- افسر سیمابی ---- ۶۰
تعلیم (نظم) .. شہ زور کاشمیری - جگناتھ آزاد .. ۶۱
غزلیات ... عرشی بھوپالی - پروفیسر شور - تحر فتحپوری ... ۶۲
مطبوعات موصولہ ---------- ۶۳

ملاحظات

کچھ صاف صاف باتیں

روزنامہ قومی آواز کی یہ خصوصیت کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے بہت صاف صاف لکھتا ہے، بہت کم کسی اور اخبار میں پائی جاتی ہے، چنانچہ اس نے اپنے ۲۹ اپریل کی اشاعت میں "بھگدڑ کیوں" کے عنوان سے جو اداریہ لکھا ہے، وہ مہاجرین کے مسئلہ میں ایک نہایت اچھے اور واضح بیان کی حیثیت رکھتا ہے، پہلے اسے آپ پڑھ لیجئے:-

یوپی کے چار پانچ ضلعوں سے مسلمان برابر پاکستان بھاگ رہے ہیں۔ وہ کیوں بھاگ رہے ہیں؟ یہ سوال کچھ ایسا ٹیڑھا نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس سوال کا سمجھنا بے حد آسان ہے ان ضلعوں میں سے کسی ضلع میں جائیے وہاں گھومئے، مسلمانوں کو سامان بیچتے ہوئے دیکھئے۔ کتنا قیمتی سامان کتنے میں فروخت کرتے ہیں، اس کا اندازہ لگائیے۔ سامان میں کیا کیا چیزیں ہیں یہ دیکھئے۔ پھر مسلمانوں سے کچھ باتیں کر لیجئے کہ وہ ہندوستان سے کیوں جا رہے ہیں؟

پاکستان کیا کیا امیدیں لے کر جا رہے ہیں، اور ان امیدوں کی بنیاد کیا ہے؟ اس کے بعد آپ بھگدڑ کی وجہ اس طرح سمجھ جائیں گے کہ پھر آپ کو کوئی شخص غلط فہمی میں مبتلا نہ کر سکے گا۔

ہاں ایک شرط ہے وہ یہ کہ انسانی فطرت کو نہ بھول جایئے گا۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اور جس فضا میں اور جن لوگوں میں پروان چڑھتا ہے۔ ان سے جدا ہونا اس کے لئے زندگی کی بڑی مسرتوں سے جدا ہونا ہوتا ہے۔ شاعر یا وطن میں جو آنسو ادب کی پیدائش کے دن سے لے کر آج تک بہا رہا ہے وہ مصنوعی موتی نہیں ہیں۔ وہ دل کے سچے جواہر ریزے ہیں ۴۷ء میں جناح صاحب نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ہندوستان، پاکستان کے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کو مار مار کر پاکستان بھیج رہا ہے اور دوسری طرف پنجاب اور سندھ کے ہندوؤں کو بلا رہا ہے اس کا ان دونوں باتوں سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کی اقتصادیات کو برباد کر دیا جائے۔ اس بیان میں سیاسی اغراض کے تحت انھوں نے انسانی فطرت کو نظر انداز کر دیا تھا۔

ہاں تو سوال یہ ہے کہ مسلمان کیوں پاکستان جا رہے ہیں؟ بلکہ اگر انسانی فطرت کو بھول کر اس سوال پر غور نہیں کرنا ہے تو اس کو یوں دیکھنا چاہئے کہ مسلمان کیوں اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر جلاوطن ہو رہا ہے؟ وہ کیوں آم کے باغوں، کوئل کی کوکوں، ساون کی پھواروں، بزرگوں کے مزاروں، باپ دادا کی ہڈیوں کو چھوڑ رہا ہے؟ چھوڑنا تو ایسا چھوڑنا یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنا!! یہ بات بھی یقینی ہے کہ بھاگنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو نامعلوم مستقبل کی طرف جا رہے ہیں اور جن کے دلوں کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ خدا جانے پاکستان میں کیسی گزرے۔ یہ سمجھنا بھی غلطی ہوگی اور انسانی فطرت سے ناواقفیت ہوگی کہ بھاگنے والوں میں ہر شخص یا ان کی اکثریت اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہے۔

ذرا یہ بھی دیکھئے کہ جانے والے کون کون سا سامان بیچ رہے ہیں؟ سلائی کی مشینیں، ریڈیو سٹ، سائکلیں، قالین، ڈرائنگ روم فرنیچر، مسہریاں، ڈنر سٹ، چائے کے بڑھیا سٹ، قیمتی کپڑے، سوٹ، کمبل اور دوشالے، دگیں وغیرہ یہ سب سامان کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔ سلائی کی مشینیں ۲۰ - ۲۰ روپیہ میں بائیسکل ۳۰ روپیہ میں۔ ریڈیو سٹ ۵۰ روپیہ میں۔ اور مکان؟ جو چاہے اس پر قبضہ کرلے۔ بیچنے والے کون کون ہیں؟ کاریگر، مزدور، پیشہ ور، کسان نچلے اوسط طبقے کے لوگ، اوپر کے اوسط طبقے کے لوگ، بڈھے، اپاہج، عورتیں، برقع پوش عورتیں، بچے۔

ان لوگوں سے ملئے اور یہ پوچھنے سے پہلے کہ وہ کیوں جا رہے ہیں یہ پوچھئے کہ ان کی زندگی میں پاکستان بننے کے بعد سے کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ آپ سے اوپر طبقے کے لوگ کہیں گے کہ وہ دو پشتوں سے سرکاری ٹھیکے دار تھے، لیکن اب ٹھیکے ان کے بجائے نئے لوگوں کو دے دئے گئے ہیں، اس وجہ سے ان کی آمدنی بند ہوگئی ہے۔ ایک باپ کہے گا کہ اسکے چار لڑکے ہیں چاروں کے چاروں تعلیم یافتہ بے کار پڑے ہوئے ہیں، دفتر کے لوگ درخواستیں تک نہیں لیتے مقابلہ کے امتحانوں میں وہ بیٹھتے ہیں تو آتے نہیں، اس بیکاری سے فاقوں کی نوبت آگئی ہے، دکان دار رونا روئے گا کہ

بازار کا اور خرید فروخت کا رنگ کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ اس کا کام ہی نہیں چلتا، کاریگر کہیں گے کہ ان کو کام نہیں ملتا ہے۔ دھوبی کہیں گے کہ کپڑا دینے والے کہتے ہیں کہ اگر تم کپڑے لیکر پاکستان بھاگ گئے تو؟ یہی بات درزی بھی کہے گا۔ اب سوال کیجئے کہ تمھارے ضلع کے سرکاری افسران اور کانگرسی اور پبلک کارکنوں کا کیا حال ہے تو وہ ان میں سے بہتوں کی برائی کریں گے اور چند کی تعریفیں، پھر کہیں گے کہ حکومت برائی کرنے والوں کو نہ سزا دیتی ہے اور نہ اچھائی کرنے والوں کی تعریف کرتی ہے۔ بھاگنے والے ٹنڈن جی کی تقریروں کا تذکرہ کریں گے اور کہیں گے کہ ان تقریروں سے برے کانگرسی اور پبلک کارکن شیر ہو جاتے ہیں اور ہم کو ستانے لگتے ہیں اور ہاں وہ اپنے پڑوسیوں کی شکایت کریں گے جو ان کو ایک دو طریقوں سے نہیں سیکڑوں طریقوں سے تنگ کرتے ہیں۔ جس سے وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس سرزمین میں ان کے لئے جگہ نہیں۔

یہ ایک اچٹتی ہوئی تصویر ہے حالات کی۔ اب بتائیے کہ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد آپ کیا نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسلمان کیوں بھاگ رہا ہے؟

پاکستان کاریگروں کو بلا رہا ہے — ٹھیک ہے۔ سابق لیگی بھڑکا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ بھاگنے والے اپنے جرم کو ہلکا کرنے کے لئے بہتوں کو ساتھ لے کر بھاگنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی درست اور اسی قسم کی درجنوں باتیں درست ہیں، لیکن وجہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کو بھروسہ نہیں ہے کہ ان کے وطن میں ان کا جان و مال محفوظ ہے اور ان کی ترقی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس بات کا یقین ہے کہ مشرقی بنگال میں اگر پھر کچھ ہوا تو اس کا بدلہ ان سے نہیں لیا جائے گا۔

یہ ہے منطقی اور بنیادی وجہ مسلمانوں کے بھاگنے کی۔ اس کے علاوہ جو وجہ بتلائی جائے اسے ماننا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قومی آواز نے ترک وطن کرنے والے مسلمانوں کے جذبات کا بہت صحیح اندازہ کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبصرہ ناکافی ہے اگر اسی کے ساتھ یہ بھی نہ بتایا جائے کہ بھارت کے مسلمانوں کا موجودہ ذہنی اضطراب دور کرنے کے لئے حکومت کو کیا کرنا چاہئے۔

غالباً اب وقت "گومگو" میں رہنے کا نہیں ہے بلکہ صاف صاف کہہ دینے کا ہے اس لئے اڈیٹر قومی آواز کا فرض تھا کہ وہ کچھ عملی تجاویز بھی حکومت کے سامنے پیش کرتا۔ اڈیٹر قومی آواز کے ذہن و دماغ میں یقیناً بعض تجاویز ہوں گی لیکن وہ کیا ہیں ہم کو ان کا صحیح علم نہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک جو موثر صورتیں بھارت اور پاکستان دونوں جگہ اقلیت میں اعتماد پیدا کرنے کی ہو سکتی ہیں اور جن پر حکومت ہی عمل کر سکتی ہے۔ یہ ہیں:-

---

۱۔ پاکستان اور بھارت کی تمام ان جماعتوں کو جو حکومت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف رکھتی ہیں خلاف قانون جماعت قرار دیدیجائے اور ان کو ہر ایسی تحریر یا تقریر پر سخت سزا دیجائے، جو کسی نہ کسی پہلو سے مذہبی منافرت یا فتنہ و فساد کا باعث ہو سکتی ہے اور اس میں بڑے یا چھوٹے کا کوئی امتیاز نہ کیا جائے۔

۲۔ ان تمام اخبارات پر جو اپنی اشتعال انگیز تحریروں سے حکومت کی پالیسی کو نقصان پہونچانا چاہتے ہیں اور ہندو مسلم اختلاف کا باعث ہو سکتے ہیں، سنسر قایم کر دیا جائے۔

۳۔ آیندہ کے لئے یہ احکام جاری کر دئے جائیں کہ اب اگر کسی ضلع میں فساد ہوگا تو وہاں کے مقامی افسران کو فوراً معطل کر دیا جائے گا اور اگر تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہوا کہ انھوں نے اپنے فرض کی ادائی سے قصداً گریز کیا تو انھیں نہ صرف یہ کہ ملازمت سے علٰحدہ کر دیا جائے گا بلکہ سخت سزا بھی دیجائے گی۔ لیکن یہ تحقیقات ایک ایسی کمیشن کے ذریعہ سے ہونا چاہئے جس کو اقلیت کی نصف نمایندگی ضرور حاصل ہو۔

۴۔ اقلیت کے تمام افراد کو جو اسلحہ رکھ سکتے ہیں، آزادی کے ساتھ اسلحہ رکھنے کی اجازت دیجائے اور تمام حکام ضلع کے نام احکام جاری کر دئے جائیں کہ بلا پس و پیش فوراً ان کو لائسنس دیدئے جائیں۔

اگر نہرو لیاقت معاہدہ میں ان شرایط کا بھی اضافہ ہو جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں جگہ کی اقلیت مطمئن ہو جائے گی اور ترکِ وطن کا خیال ان کے دلوں سے بالکل محو ہو جائے گا۔

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

۱۹۵۱ء

اس وقت تک کے تمام سالناموں سے مختلف ہوگا، نہ وہ ادبی ہوگا نہ انتقادی بلکہ ایک بسیط اقتصادی و سیاسی تبصرہ ہوگا تمام اسلامی ممالک پر جو عہدِ حاضر کی پیچیدہ سیاست اور اشتراکیت و جمہوریت کی موجودہ آویزش کے پیش نظر ایک **ضخیم کتاب کی صورت میں** پیش کیا جائے گا۔

یہ اقتباس ہوگا مارس ہنڈلس کی مشہور کتاب In Search of Adventure کا جس کے پیش لفظ کا نمونہ آپ اس ماہ کی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت عالم اسلامی کس دور سے گزر رہا ہے اور جس مستقبل کی اسے جستجو ہے وہ اسے اشتراکیت کی طرف لے جا رہا ہے یا جمہوریت کی طرف۔

منیجر نگار

ایک مستقبل کی تلاش

حال ہی میں ایک یوروپین سیاح ماریس ہنڈس (Maurice Hindus) کی کتاب شایع ہوئی ہے، جس کا نام ہے "In Search of a future" یہ کتاب نتیجہ ہے ایران، مصر، عراق اور فلسطین کی سیاحت کا جو اس نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ وہاں کے حالات کا مطالعہ کرکے ان ملکوں کے مستقبل کے متعلق خود کوئی رائے قایم کرسکے اس نے سیاحت کے لئے اس سرزمین کو اس لئے پسند کیا کہ مشرق وسطی کے مسایل سے روس و امریکہ کو جو گہرا تعلق حاصل ہے، اس کے اسباب و نتائج کو اچھی طرح سمجھ سکنے کے لئے خود وہاں جانا ضروری تھا۔

اس نے ایران میں کافی وقت صرف کیا کیونکہ یہی وہ ملک ہے جو روس و امریکہ کے درمیان عرصہ سے "استخوانِ جنگ" بنا ہوا ہے اور جس کا وزن یہاں کی سیاسی ترازو کے پلہ کو جس طرف چاہے جھکا سکتا ہے، اس نے گاؤں گاؤں جاکر یہاں کی اقتصادی و معاشی حالات کا مطالعہ کیا، اس نے ہر طبقہ کے لوگوں سے ملکر ان کے رجحانات کا پتہ چلایا اور وہ یہاں کی آبادی کے افلاس، ملک کی تباہ حالی اور حکومت کی بدنظمی سے اس قدر متاثر ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ یہاں کی سیاسیات کا مطالعہ کرتا، یہاں کے اقتصادی حالات پر آنسو بہانے لگا اور سوچنے لگا کہ اس خوبصورت، زرخیز، شاداب و شگفتہ سرزمین کو اس کے ہولناک مستقبل سے کیونکر بچایا جاسکتا ہے۔

انھیں تاثرات کو لئے ہوئے وہ ایران سے مصر گیا، اور مصر سے عراق و فلسطین پہونچا، لیکن بجائے اس کے کہ ان تاثرات میں کمی ہوتی، ان میں اور اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ اسنے ان ملکوں کی حالت بھی ایسی ہی خراب پائی اور وہ آخرکار اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر مشرق وسطی کی مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کو دنیا میں باقی رہنا ہے تو انھیں فلسطین کی اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہیے جس نے صحرا و ریگستان کو چند دنوں میں خدا جانے کیا بنا دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ اگر فلسطین میں یہودی نہ ہوتے تو مشرق وسطی کی نجات کے لئے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ ان کو دیکھ کر مشرق وسطی کے مسلمان سمجھ سکیں کہ محنت و کوشش اور صحیح و صالح تدابیر سے انسان کیا نہیں کرسکتا۔

اس نے ایران، مصر اور عرب ہر جگہ عام آبادی اور خصوصیت کے ساتھ کاشتکاروں اور مزدوروں

کے حالات کا مطالعہ کرکے افسوس کیا ہے کہ مصر میں جسے کرۂ زمین کا چمنستان کہنا چاہئے۔ تین چوتھائی دیہی آبادی پاؤں کی ایک خاص بیماری (Bilharziasis) میں صرف اس لئے مبتلا نظر آتی ہے کہ وہ جوتا نہیں خرید سکتے۔ شام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہاں کی دو تہائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور ۷/۸ حصہ زمین کا ان زمینداروں کے قبضہ میں ہے جنھوں نے جاکر کبھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ کاشتکاروں کی حالت کس قدر خراب ہے۔

عراق میں جہاں قابل کاشت زمین کی کمی نہیں، صرف ۱/۵ حصہ کاشت کیا جاتا ہے اور وہ بھی نہایت تکلیف و مصیبت کے ساتھ۔ وہ کہتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے کاشتکار طبقہ کا تصور گویا "فاقہ و موت" کا تصور کرنا ہے اور یہاں کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، صاف پانی حاصل کرنے کے لئے بھی ان کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ جانوروں کو بھی اپنے ہی جھونپڑوں میں رکھتے ہیں اور گندگی نے ان کی صحتوں کو بالکل تباہ کر رکھا ہے۔

سیاح مذکور جب ان ملکوں کی سیاحت کرکے اسرائیلی حکومت میں پہونچتا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور اس کو یقین نہیں آتا کہ کیا یہ بھی اسی سرزمین کا حصہ ہے، جسے وہ اس قدر بدحال دیکھ چکا ہے۔ چھ مہینے کی سیاحت کے بعد سب سے پہلے اُسے یہیں جرأت ہوئی کہ وہ ایک سلیقہ کی دوکان سے ناسپاتی لیکر کھا سکتا اور صاف پانی سے نہا سکتا۔ ہرٹزس، یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اسرائیلی حکومت کیونکر چند دنوں میں صحرا در یگستان کو باغ و بہار بنا سکی۔ اس نے دلدلی زمینوں کو جہاں کے مچھروں سے ملیریا پھیلتا تھا ختم کر دیا، آبپاشی کے ذرایع پیدا کرکے خشک ریتیلے میدانوں کو گلزار بنا دیا، ان حصوں کو جہاں کبھی غلّہ کا ایک دانہ پیدا نہ ہوتا تھا، ہری بھری کھیتیوں میں تبدیل کر دیا اور ان مقامات میں جہاں لوگ پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترستے تھے، نہریں بہا دیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو سکا کہ انھوں نے سب سے پہلے کاشتکاروں کی اصلاح کی، کاشت کے نئے طریقوں سے انھیں آگاہ کیا، کاشتکاروں میں زندگی کا وہ احساس پیدا کیا جس سے وہ اس وقت تک بالکل بے خبر تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین کی بے آب و گیاہ زمین سونا اُگلنے لگی۔

سیاح مذکور کہتا ہے کہ ایران، مصر و عراق سب کو اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے اور اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں کاشتکار طبقہ کی اصلاح کرنا چاہئے۔

اس نے ایران میں تودہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اپنے ایک سال کے دوران اقتدار میں آذربیجان کے اندر کافی اصلاح کرنا چاہی لیکن وہ معمولی سی طہرانی فوج کے سامنے نہ ٹھہر سکی (حالانکہ کچھ زمانہ قبل اسی فوج کو کاشغائی علاقہ کے قبایل نے شکست فاش دیدی تھی)، اس کا سبب صرف یہ تھا کہ تودہ تحریک کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوئی اور ان کی حمایت نہ حاصل کر سکی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ کاشتکاروں کی یہ سقیم حالت ہمیشہ ایسی ہی رہیگی غلط ہے، کیونکہ روس میں بھی کاشتکاروں کی بالکل یہی حالت تھی اور جب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تو انھوں نے حکومت کا تختہ اُلٹ کر رکھدیا۔

سیاح مذکور لکھتا ہے کہ :- ہمارے مدبرین یہ تو سوچتے رہتے ہیں کہ روس کے اقدامات اور اشتراکیت کی ریشہ دوانی کو کیونکر ختم کیا جائے، ایشیا و افریقہ کی انقلابی تحریکوں پر کس طرح قابو پایا جائے، نئی نئی زمینیں کھود کر معلوم کیا جائے کہ پٹرول کے چشمے کہاں کہاں ہیں، اور جدید مالیاتی منصوبے قایم کرکے نئی نئی منڈیاں پیدا کی جائیں - لیکن غریب ملاح و کاشتکار کا کوئی ذکر نہیں کرتا - حالانکہ انھیں سمجھنا چاہئے کہ اگر زمین کے مسئلہ کو طے نہ کیا گیا تو کاشتکار خود اسے طے کرے گا اور اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو روس میں ہوا اور اب چین میں ہمارے سامنے ہے یعنے اشتراکیت اور صرف اشتراکیت -

(نیاز)

پیش لفظ

یہ کتاب ان ملکوں کے حالات پر ہے جو اپنا مستقبل پالینے کی جستجو میں ہیں یعنے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ - اس کتاب کا موضوع انھیں ملکوں کی آبادی اور سرزمین ہے، وہاں کے شہروں اور کلچر کا ذکر محض ضمنی طور پر آیا ہے - میں سمجھتا ہوں کہ یہودی فلسطین جس کا نیا نام اسرائیلی حکومت ہے ان قوموں کی ترقی کے لئے ایک نمونہ ستور العمل بن سکتا ہے، بشرطیکہ وسطی مشرق کی مسلمان قومیں اپنے اپنے ملک کی طبعی حالات کے پیشِ نظر اس نمونے اور دستور العمل سے فایدہ اُٹھائیں جو اسرائیلیوں نے صحرا و بیابانوں کو سرسبز و زرخیز بنا کر پیش کیا ہے اور اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو انھیں ایک سخت خونیں انقلاب کا منتظر رہنا چاہئے، جس کا ہر سل ایرانی آزربیجان میں بھی ہو چکا ہے -

یہودی فلسطین آج سے ایک نسل پہلے تک اسی طرح خواب خرگوش میں مبتلا تھا جس طرح عرب فلسطین - لیکن اس مختصر مدت میں اسرائیلی فلسطین میں باوجودیکہ وہ بیرونی اور خصوصاً برطانوی اثرات کا ہدف بنا رہا، حیرتناک ترقی کرلی ہے اور اس علاقے کی اندرونی ترقیوں کا نہایت مکمل دستور العمل بن چکا ہے، اس کے برخلاف مشرق وسطے کے اسلامی ممالک جو ابھی تک بیرونی مداخلت سے محفوظ ہیں، اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اندھیرے کو ٹٹول رہے ہیں -

یہ تصنیف : تو سیاسی حجت و بحث ہے نہ تاریخی مقالہ - مجھے صیہونی یا عربی فلسفے سے بھی واسطہ نہیں ہے - اس کتاب میں میرا واسطہ عربوں، ایرانیوں، مصریوں اور یہودیوں سے صرف انسانیت کا واسطہ ہے

فلسطین کا لفظ جن سیاسی اختلافات اور تاریخی موضوعات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جو بین الاقوامی نزاعیں پیدا ہو سکتی ہیں، اس پر نہایت قابل لکھنے والوں نے قلم اُٹھایا ہے - لیکن فلسطین کی رایل کمیشن نے ۳۷ء میں جو رپورٹ شایع کی ہے وہ اس مسئلہ پر نہایت واضح تصنیف ہے - اس کے علاوہ Summer Wells کی تصنیف We can not fail بھی ایک ایسی کتاب ہے جو اس موضوع پر جامع اور دستاویزی شہادت ہونے کے ساتھ ہی برطانوی ذمہ داریوں اور ناکامیوں، امریکن وعدوں اور بدعہدیوں پر کافی روشنی ڈالتی ہے -

اسرائیلی حکومت کا مستقبل جو کچھ بھی ہو - لندن کا دفتر خارجہ اور امپیریل جنرل اسٹاف یہودیوں کے ساتھ جو سلوک

چاہے کرے، مگر اس قوم کا یہ روشن کارنامہ کہ اس نے ریگستانوں کو سرسبز و شاداب باغوں میں بدل دیا ہے کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ خوش قسمتی سے میں آنجہانی Wendell Willkie سے متعارف تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے ایشیائی ملکوں کی پستی کے متعلق ایک نہایت اہم بات کہی کہ "ان کروروں کسانوں کے پاس اگر صرف اتنی زمین ہوتی کہ وہ سال میں ایک جوڑا کپڑوں کا، ایک جوڑا جوتہ، دو بنیان، دو قمیص اور دو موزے ہی خرید سکتے تو خیال کرو کہ ہم انکے ساتھ کتنی بڑی تجارت کرسکتے تھے!" — ولکی خود پانچ زراعتی فارموں کا مالک تھا اس لئے کاشت اور آراضی کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہ کہنا کہ افریقہ و ایشیا کی نہایت پست قوموں کے افلاس کی جڑ آراضی کی غلط تقسیم ہے نادرست نہ تھا اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ کروروں انسانوں کی زمین سے محرومی اور اسی کے ساتھ پرانے طریقوں اور آلات سے کاشتکاری کے اندر وہ طوفان بھی چھپا ہوا ہے جو جوالامکھی کے دھوئیں کی طرح دُنیا کے بہت بڑے حصے پر منڈلا رہا ہے اور اسوقت ایران، مصر، عراق، اور ایشیا و افریقہ کے دوسرے ملک بھی اس طوفان عظیم کے تذبذب میں مبتلا ہیں۔ باوجود اس کے کہ اسرائیلیوں کی زرعی پالیسی اور ترقی، اس کی آبادی کی صحت مندی، کاشتکاروں کی پرامید زندگی، بلاشبہ ایک مستحکم چٹان ہے مگر ان کا اندرونی امن و سکون یقیناً اقلیتوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ یہودی فلسطین نے جو امن اور خوش حالی حاصل کرلی ہے وہ ایسی چیز نہیں جسے وسطی مشرق کی مسلمان قومیں حاصل نہ کرسکتی ہوں۔

Givat Brener ایک اسرائیلی گاؤں کا نام ہے۔ میں اس گاؤں کو دیکھنے گیا تھا اور جب میں اسکے سرسبز کھیتوں میں گھوم رہا تھا، میں نے دیکھا کہ سیاہ چادریں اوڑھے عرب عورتوں اور پھٹے پُرانے کپڑے پہنے عرب بچوں کے ہجوم نے ایک یہودی کی گاڑی پر ہلہ بول دیا ہے۔ میں نے اسے فرقہ واری بلوہ سمجھ کر گاؤں کے سکریٹری سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ بلوہ نہیں ہے بلکہ جب کوڑے کی گاڑی آتی ہے تو یہ لوگ اس میں سے کچھ کارآمد چیزیں ڈھونڈنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور گودڑ وغیرہ چن لے جاتے ہیں۔

یہودیوں کے پاس کوئی نیا موسےٰ نہیں آیا جس نے اپنا عصا مار کر فلسطین میں پانی کے چشمے جاری کردئے ہوں، بلکہ یہودیوں نے اسی زمین سے پانی نکال کر صحرا کو سیراب کیا اور زمین کو زرخیز بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایک کے سوا باقی سب دلدلوں کو خشک کرکے طاعون اور ملیریا کو ختم کردیا ہے جو صدیوں سے عرب باشندوں کیلئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے صحرا اور پہاڑیوں پر اپنا پسینہ اور روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ ایشیا و افریقہ میں یہودیوں سے زیادہ ہوشیار اور محنتی شاید ہی کوئی ہو۔ ان مقامات کی مردہ زمین میں اس طرح کہیں بھی جان نہیں ڈالی گئی کہ بیابانوں میں روٹی اور پھل اُگنے لگے ہوں۔ ازکار رفتہ مویشیوں کو نئی زندگی دینا، بھیڑ، بکریوں اور دیگر مویشی کو کارآمد و نفع بخش بنالینا اور پولٹری کی افراط اس میں شک نہیں بڑا کارنامہ ہے۔

اسرائیل کے یہودی دولت مند تو نہیں بن گئے ہیں مگر سالانہ ایک بوڑا کپڑا اور جوتا جس کا ذکر ولکی نے کیا تھا فرد، خرید سکتے ہیں۔ یہ بات عرب ملکوں کے لئے خواب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کے صحیح مخاطب چونکہ امریکن لوگ ہیں اس لئے میں نے ایران کے ذکر کو زیادہ جگہ دی ہے۔ میں نے جن ملکوں کی سیاحت کی ان میں ایران سب سے زیادہ دلکش ملک ہے۔ ایک غیر ملکی نے ایران کو "امریکا کی لاڈلی" کا نام دیا تھا۔ بلاشبہ روس اور امریکہ کی کشاکش میں ایران کنجی کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ایران تو امریکہ کی لاڈلی ہونا چاہئے۔

ایک انگریز مصنف (A. C. Edwards) نے لکھا ہے کہ "ایران میں جو حکومت بھی قایم ہوتی ہے، بیشتر برطانوی یا روسی سفارت خانے کی امداد سے ہوتی ہے۔" مجھے اس پر اعتراض ہے۔ کیونکہ غیر ملکی اثر کے اعتبار سے امریکہ روس اور برطانیہ دونوں پر سبقت لے گیا ہے۔ چنانچہ آج ایرانی فوج کی نئی تنظیم، امریکن فوجی مشن کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور پولیس کو از سر نو منظم کرنے کے لئے بھی امریکہ ہی کا ایک فوجی افسر مقرر کیا گیا ہے۔

امریکہ کے دوست اور دشمن، صحیح یا غلط طور پر، ۱۹۴۶ء میں ایران کو صوبۂ آذربیجان میں جو کامرانی حاصل ہوئی اس کا سبب امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وزیر اعظم غضنام نے روس سے تیل کی جن مراعات کا وعدہ کیا تھا، ۱۹۴۷ء میں مجلس نے جس استقلال کے ساتھ اس روسی مطالبہ کو مسترد کیا، وہ بھی امریکہ کے اثر و نفوذ ہی کا نتیجہ تھا۔

لیکن امریکہ کے اس اثر و نفوذ کے باوجود ایران کا مسئلہ واشنگٹن کے لئے ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے، اور آئندہ امریکہ کا یہ اثر رہے یا نہ رہے مگر میں اپنے یقین کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ ایران کے بارے میں واشنگٹن کو جتنی وسیع اور مکمل معلومات حاصل ہیں ایسی وسط ایشیا کے کسی دوسرے ملک کے بارے میں حاصل نہیں ہیں۔ جارج ایلن کی سفارت کے زمانہ میں، جو خود ایک صحافی رہ چکا تھا۔ اس کے اسٹاف کی توجہ سے ایرانی زندگی کا کوئی پہلو مشکل سے بچ سکا۔

کے انجینئرنگ فرم Morrison-Knudsen کی آٹھ سو صفحے کی رپورٹ ایران کے متعلق اطلاعات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ رپورٹ حکومت ایران کی خواہش پر اس فرم کے ماہروں نے طیار کی تھی، لیکن یہ رپورٹ شایع نہیں ہوئی۔ مجھے طہران نیشنل بنک کے گورنر نے اس کی کاپی دیکھنے کو دی تھی اور اس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ رپورٹ ایران کی کتنی بڑی خدمت ہے۔ ایران کے متعلق ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان جو معرکہ بھی ہو اور اس ملک میں امریکہ کی موجودہ پوزیشن باقی رہے یا نہ رہے، لیکن جو مواد اور معلومات امریکہ کے پاس ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایران کے باب میں پریسیڈنٹ کانگریس کوئی غلطی کر بیٹھے تو اس کا سبب یہ نہ ہوگا کہ امریکہ کو یہاں کی بابت کافی اطلاعات حاصل نہ تھیں۔

ان تمام حالات کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت اسرائیلی حکومت ہی تنہا ایسی حکومت ہے جو نہ صرف ایران

کے بلکہ وہی مصر، عراق اور شام وغیرہ کے لئے نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اسرائیلی اصول ترقی جوں کے توں ان ملکوں کے لئے موزوں ہوں گے لیکن یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ یہودی حکومت کو سامنے رکھ کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

فلسطین کے یہودیوں کے بارے میں لارنس آف عربیا نے تیس سال پہلے لکھا تھا:۔

"ان کی (یہودیوں کی) اسکیموں کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوگا کہ موجودہ عرب آبادی خود انکی (یہودیوں کی) مادی و اقتصادی سطح پر آجائے۔ یہ کام یہودیوں کی ترقی کر لینے کے فوراً بعد شروع ہو جانا چاہئے۔ ایسا ہو سکا تو عرب دنیا کے مستقبل کے لئے اہم نتیجے رونما ہو سکیں گے۔"

اسرائیلی حکومت سے عربوں کی دشمنی کتنی ہی گہری کیوں نہو، لیکن اب وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہودیوں نے کس کامیابی کے ساتھ اپنے مسایل کو حل کیا ہے اور اسے نظر انداز کر دینا بالکل ایسی بات ہوگی جیسے ڈاکٹر کسی کو پنسلین تجویز کرے اور وہ انکار کر دے محض اس لئے کہ اس علاج سے اس کا پڑوسی جس سے اس مریض کی مخالفت تھی شفا پا چکا ہے۔

(باقی)

طوفانِ محبّت

حضرت ہوشؔ بلگرامی المخاطب بہ ہوش یار جنگ کی معیاری مثنوی۔ جس میں حسن و عشق کی دلدوز داستان اس زبان اور لب و لہجہ میں بیان کی گئی ہے جس کو اب دنیا ترس رہی ہے اور کہیں نہیں پاتی۔

اس مثنوی کو وہ خصوصیت جو کسی اور مثنوی میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ اس میں مذہب و اخلاق کے نکات بھی انتہائی دلآویز رنگ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں فاضل مصنف نے مثنوی نگاری پر تاریخی و تنقیدی روشنی بھی ڈالی ہے اور حضرت نیازؔ فتحپوری کا ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:۔ "فنی محاسن اس مثنوی میں جا بجا اتنے بکھرے ہوئے ہیں کہ: ان کو میں سمیٹ سکتا ہوں اور نہ وجدان ان کی وضاحت سے مطمئن ہو سکتا ہے۔" ظاہری حسن کے متعلق غالباً اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ وہ بہترین بیرونی ٹائپ میں چھپی ہے اور نہایت دبیز ولایتی کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

ضخامت ۲۹۸ صفحات۔ قیمت مجلد سات روپیہ۔ غیر مجلد پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ سکرٹری نواب ہوش یار جنگ۔ سرفراز منزل۔ برکت پورہ۔ حیدر آباد دکن

یا

منیجر نگار۔ لکھنؤ

شبلی کا فارسی تغزل

شبلی کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ مولوی ہوتے ہوئے بھی خوش مذاق تھے۔ ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ استعجاب و تحسین کی بات نہیں کہ سیرۃ النبی اور ندوہ کا موسس ایسے شعر بھی کہے کہ:

دل در ادائے طاعت حق حیلہ جو نبود — عذرم بنہ کہ بادہ بقدر وضو نماند

بے حاصلی نگر کہ بایں دوری از درش — صد جائے بہر بوسہ نشاں کردہ ایم ما

اور دن کے اکثر حصہ میں حدیث و فقہ کا درس دینے والا تنہائی کے لمحات میں فرشتوں سے سرگوشی کرنے کے بجائے "دل باختن و دل گرفتن" کی باتیں بھی کرے — ندوہ کی چہار دیواری میں امام المفسرین رازی، امام المتکلمین غزالی کا منفرد جانشین جب بمبئی کی ثمربار و سکر آفریں وادیوں میں پہونچے تو ہر چیز کو بھلا کر فطرت و مظاہر فطرت کا تنہا پرستار نظر آئے جس کے جذبات و احساسات انسانیت کے بھرپور انجذاب سے مملو ہوں اور وہ اس کارگاہ ذوق آفریں و آشوبگاہِ تقویٰ شکن کے مظاہر پر رقص و تواجد میں آکر یہ کہہ اُٹھے:۔

ز ذوقِ طبع شبلی من در اول روز دانستم — کہ در آشوبگاہِ بمبئی در بازد ایماں را

اور یہی نہیں کہ ان نزہتوں کو اپنے ہی تک محدود رکھے بلکہ ایک صاحبِ ذوق انسان کی طرح وہاں کے نظر فریب مرقعوں کو بیان کرکر کے "یارانِ شاطر" کو "صلائے عام" دے رہا ہو کہ:۔

بیا اینجا کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی — بتان آذری را، دلبرانِ شام و ایراں را

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را،

یہ ہے شبلی کی وہ انفرادیت جس کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ "لاشریک لہٗ"

جس طرح ہمارے یہاں غالب کے فارسی سرمایہ پر بہت کم توجہ کی گئی۔ یہاں تک کہ آج غالب کے بہت سے پرستار ایسے ملیں گے جنھوں نے اس کا فارسی کلام ایک نظر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اور بقول خود اس کے "نقش بیرنگ" ہی میں ہر رنگ کی تلاش یا رنگ آمیزی میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی طرح شبلی بھی شاعر کی حیثیت سے صرف اُردو کے چند قطعوں کے سرمایہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کے نگارخانۂ فارسی کی طرف جو عجیب و غریب نقوش سے آراستہ ہے کسی کی توجہ منعطف نہیں ہوتی — جس طرح آج غالب کے ایسے فارسی اشعار سے بہت کم لوگ واقفکار ہوں گے۔

وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

اسی طرح شبلی کے ایسے بے نظیر اشعار سے بھی بہت سے کان آشنا نہیں۔

تماشا داشت آں ہنگامہ خیزیہائے امیدم دریغ از زود کاریہا کہ مکتوب تو وا کردم

غنچہ نشگفتہ جنوں تاختن آورد بمن، تا دگر از اثرِ بادِ بہاری چہ شود

فال وصل ار چہ بگیرند ز آغوش و کنار ایں شگوں از گرہِ بند قبا نیز کنند

میگویدم کہ "دل بکسے دادۂ مگر" مارا بہ نکتہ دانی او ایں گماں نبود

شبلی کا فارسی مجموعہ غزلیات مختصر سا ہے۔ جس میں کل ۱۱۶ غزلیں ہیں اور ۸۱۷ اشعار۔ اس میں صرف ۴۸ غزلیں ایسی ہیں جو مکمل کہی جا سکتی ہیں اور باقی غزلیات میں سے کسی میں ۲ شعر ہیں اور کسی میں ۳ یا ۴ — آخر میں ۶ غزلیں ابتدائی دور کی ہیں جن میں کل ۲۴ شعر ہیں۔ لیکن یہ اتنا مختصر سا مجموعہ بڑے بڑے مجموعوں پر بھاری ہے۔

شبلی کے تغزل میں شراب جیسا تند سکر اور نشہ جیسی مسحور کن ربودگی ہے شروع سے آخر تک ایک رنگ چھایا ہوا ہے ہر غزل شوق، سرمستی، مسرت، والہانہ بیان، اور شوخی و رندی کا مجموعہ ہے۔ پورے کلام میں چڑھتے ہوئے نشہ اور بڑھتے ہوئے جوش و ولولہ کا تیز احساس ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں طربیہ تاثیر اتنی فراوانی ہے کہ ناممکن ہے۔ کوئی مذاق سلیم رکھنے والا انسان ان کو پڑھتے وقت کوئی دوسری بات یاد رکھ سکے۔ یہی ان کی بے مثل انفرادیت ہے۔

شبلی کے یہاں سوز و گداز اور گداختگی و برشتگی نہیں بلکہ بجائے اس کے ایک بھرپور سرمستی اور ایک سیال ارتعاش۔ باتیں وہی ہیں جو عموماً "حکایاتِ شباب" میں ہوا کرتی ہیں یا ہو سکتی ہیں مگر ان کا بیان ایسا ہے جو ناواقف محض کو بھی کچھ دیر کے لئے دست افشاں ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شبلی کا انداز بیان ان کو اپنے دوسرے ساتھیوں سے علٰحدہ کر دیتا ہے۔ ان کا طرۂ امتیاز یکرنگی ہے۔ یعنی پورے مجموعہ میں تصوف و اخلاق کا ایک جگہ بھی ذکر نہیں۔ ہر جگہ "خورشید سے دست و گریباں" ملیں گے۔ یہی صداقت ان کے خلوص کی ضامن ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ تصوف و اخلاق کے لئے مثنوی مولانا روم یا خود انکی بہت سی دوسری تصنیفات کیا کم ہیں ——— اور اب کیا ضروری ہے کہ شعر میں بھی اس "بد مذاقی" کا ثبوت دیا جائے — لہذا یہاں انھوں نے اپنے اصلی روپ یعنی سچی انسانیت و مذاق سلیم کا ساتھ دیا۔ یہی ان کی بلندی ہے اور یہی ان کی صداقتِ منفرد۔

ان کے اشعار میں جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے پیرایۂ بیان کی شوخی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دل میں اُٹھنے والے طوفان جذبات کی ہو بہو عکاسی ہے۔ وہ چونکہ زیادہ تر کتابی و اضافی باتیں کہا کرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے لئے مجبور تھے۔ جس لباد کو وہ پہنے ہوئے تھے اور جس مسند پر متمکن۔ اس کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ ہر وقت رازی و غزالی کے سعادت مند ورثہ دار کی حیثیت سے جلوہ گر رہیں اس لئے جب بھی موقع ملتا تھا تو وہ محرکات و احساسات کی شدت سے ابل پڑتے تھے۔ سعی ضبط کے

باعث ان میں شدت تاثر بڑھتی ہی رہتی تھی اور جب بھی ان کا اظہار ہوتا تھا تو پگھلے ہوئے لاوے کے مانند ان کا سیل آتشیں پھوٹ نکلتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی جب بمبئی میں ہوتے تو بجائے مولانا شبلی کے صرف شبلی رہ جاتے تھے۔ اسوقت ان کی شناسائی صرف حافظ و خیام سے رہ جاتی تھی۔ مولانا روم و امام ابوحنیفہ ان کو بالکل نہیں یاد رہتے تھے۔

زہے جاں بخشئ آب و ہوائے بمبئی شبلی — طرازد خلخل و نوشاد و فرخار است پنداری

شاعری از من مجدد و راز سواد بمبئی، — حالیا شبلی شدم، رند غزلخواں نیستم

زبمبئی جو بہ ہندوستاں رسم شبلی — زہادہ بگزرم و باز پارسا گردم

اسی "وقت فرصت" کا کرشمہ ہے کہ شبلی کے اشعار صداقتِ تاثیر سے لبریز ہیں۔ ان کے اندر جو تہیج ہے وہ کسی ذہنی و ہیجانی تخیل کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ انھوں نے اپنے فطری محرکات و قلبی داعیات کو الفاظ میں منتقل کر دیا ہے۔ ان کی "حدیثِ شوق" مطلق تصورات کی رہین نہیں بلکہ کسی "تصادم" کی غماز ہے وہ خود کہتے ہیں کہ:-

پے تواں برد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست — شبلی ایں تازہ نوا ہا نہ چو مستاں زدہ ام

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر صاف صاف کہتے ہیں کہ:-

زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی — ورنہ عمرے ہر دو با ہم نفاق افتادہ بود

اور آگے چل کر جب آپ ان کے دوسرے اشعار پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ایسی "زمزمہ سرائی" وہی شخص کر سکتا ہے جو اس "ہفتخواں" کا واقف کار ہو۔ انداز بیان کی سحر کاری دیکھئے:-

آں قدر محوِ تماشائے جمالش بودم — کہ نگہ را خبر از لذتِ دیدار نہ ماند

ذوقِ حدیثِ عشق تواں دید کیں سخن — صد بار گفتہ ایم و مکرر نگشتہ است

از لذتِ ادائے ستم می تواں شناخت — کیں جور از تو بودہ و از آسماں نہ بود

جذبات کی مصوری میں شبلی کو کمال حاصل ہے وہ عشق و محبت کے واردا تی معاملات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر کھنچ جاتی ہے۔ —— جذبات سپردگی، رشک، شکوہ، معاملہ بندی، غرضکہ ہر چھوٹی بات کو ایسی فنکارانہ مہارت و واقفکارانہ چابکدستی سے شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں کہ بات بات کی حد سے نکل کر سانس لیتا ہوا پیکر بن جاتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ سادگیِ بیان اور شوخیِ ادا مستزاد ہے۔ حسب ضرورت کہیں سادگی کے ساتھ جذباتی تاثر کارفرما ہوتا ہے اور کہیں شوخی۔ وہ بات کو ایسے پہلو سے کہتے ہیں اور ایسے اسلوب سے کہ ان کا شعر پڑھکر کسی دوسرے شاعر کا شعر اسی مفہوم کا مشکل ہی سے یاد آسکتا ہے۔ دیکھئے:-

دل را بایں فریب تسلی دہم کہ یار — با ما بآں نہ ساخت کہ زود آشنا نہ بود

ہر چند نامہ ام ہمی بایست پارہ کرد — یکبار می تواں ز کفِ نامہ بر گرفت

اکنوں چہ گوئمت کہ بہائے دلم چہ بود — تو خود فراموشی و مرا نیز یاد نیست

نالہ و گریہ حریفِ دلِ خود کام تو نیست — راست گفتی کہ ازیں گریہ و زاری چہ شود

غمگیں مباش گر سخن از مدعا نہ رفت — شبلی ہنوز اول را زو نیاز بود

پرسم کہ ہیچ در دلِ تو ہست جائے من — ہر چند دانم ایں کہ سخن را جواب چیست

چہ باشد حال گر حرفے ز مضموں خواند آں بدخو — کہ از ہم پارہ سازد نامۂ ناخواندہ عنواں را

یاد آں روز یکہ من از سادہ لوحیہائے خویش — با عدو میگفتم ار راز نہانے داشتم

ان تمام اشعار میں جذباتیت کی بے کراں فراوانی ہے۔ خیال و پیرایۂ بیان بے حد سادہ ہیں۔ لیکن اس اعتبار سے بے انتہا پر کار۔ "با ما بآں نہ ساخت کہ زود آشنا نہ بود"، رضا و تسلیم کی بہترین مثال ہے۔ ایسا ہی آخری شعر واقعاتی حقیقت کا کتنا اچھا آئینہ دار ہے۔ شبلی کے یہاں خیال کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، طرزِ ادا بیحد سادہ رہتا ہے۔ وہ شاعر کے علاوہ فلسفی بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کو اپنی کائنات کی نزاکت کا احساس رہتا ہے۔ اسی لئے وہ کبھی زمین کو چھوڑ کر ستاروں تک پہونچنے کی بے حاصلی کو نہیں اپناتے۔ ان کو ہر گام پر یہ یاد رہتا ہے کہ وہ کونسی داستان سنا رہے ہیں اور اس کے لئے کس لے کی ضرورت ہے، اسی لئے ان کے نغموں میں زیر و بم تو شامل رہتا ہے لیکن گرانباری نہیں پیدا ہونے پاتی۔ وہ حیرت انگیز کار آگاہی سے خیال و ندرت اور معانی و الفاظ میں امتزاج کرتے ہیں پھر اس کے ساتھ ہی انھیں اس کی سریع التغیر کیفیت کا بھی احساس رہتا ہے۔ اسی لئے ان کی بات سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شبلی اگر کہیں اس سررشتہ کو چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ نہیں چھوٹ سکتا۔ اس لئے کہ ان کی شاعری اکتساب و مزاولت یا علمیت کی رہین نہیں بلکہ ان کی فطرت ہی شاعرانہ تھی۔ قدرت نے بڑی فراخدلی سے ان کو یہ ودیعت عطا کی تھی۔ نیز چونکہ انھوں نے اس عطیہ کا استعمال بھی برمحل کیا۔ اس لئے ان میں خارجی اضافوں کے بجائے "حقیقتِ مشتعل" کا پرتو قایم رہتا ہے ان کا وہی جوہر خارجی محرکات سے مل کر "شعلہ رنگ پیکر" بن جایا کرتا تھا۔ اسی تو ان کے ایسے کلام کی تعداد بہت کم ہے اور اس میں بھی جو غزلیں بمبئی میں لکھی گئیں یا وہاں کے تصور کے ماتحت لکھی گئیں ان میں بہ نسبت دوسری غزلوں کے جذباتی شدت و سرمستی کہیں زیادہ ہے ——— بمبئی کا نام آتے ہی شبلی جھومنے لگتے ہیں، جھومتے جھومتے بے خود ہو جاتے ہیں اور اسی عالم میں جبکہ وہ ماورا سے جدا ہوتے ہیں وہ باتیں کہتے ہیں جو صرف انتہائے عروج نشہ کے عالم میں کہی جاتی ہیں۔

ہنوز نشۂ دوشینہ در سرم باقی است — کہ درس گویم و بخشم ز جام صہبا ست

شبلیا! آں جلوۂ نیرنگ ہائے بمبئی، — بود تا وقتیکہ من خواب گرانے داشتم

یہاں تک کہ وہ انتہائے سکر میں جذبات پر قابو یافتہ نہ رہ کر والہانہ سرمستی و بیخودانہ محویت سے سرشار ہو کر پکار اٹھتے ہیں کہ

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را — طراز مسند جمشید و فرق تاج خسرو را

بہر سو از ہجوم دلبرانِ شوخ و بے پروا — گزشتن از سرہ مشکل افتاد است رہرو را
فغاں از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ زردشتی — بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضورا

اور پھر اسی سکر میں ڈوب کر "درس" دیتے ہیں کہ :-

چوں آگہی کہ فرصت عہدِ شباب چیست — مے خور دگر سخن زعذاب و ثواب چیست

کیا ان اشعار میں "کیف خاص" کی کچھ کمی محسوس کی جا سکتی ہے ؟ اور کیا وہ شخص جو شبلی سے واقف نہ ہو ان اشعار کو کسی "زاہد و عابد" کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کر سکتا ہے ؟

ان اشعار میں جتنی "علامتیں" ہیں وہ روایتی یا سماعی نہیں۔ بلکہ حقیقت سے قریب ہیں یعنی حقیقی جذبات سے شبلی عمر بھر بادۂ انگور سے دور بہت دور رہے۔ نیز تنہا شراب کا یہ اثر ہو بھی نہیں سکتا۔ ان کے جذبات شراب سے زیادہ تند تھے اور طبیعت مصوروں والی۔ ان دونوں چیزوں نے مل کر ان کے احساسات کو شعلہ ریز بنا دیا تھا۔ مزید برآں طرہ یہ کہ وہ مولوی تھے۔ مولویانہ ماحول میں رہنا پڑتا تھا جہاں ذرا سی لغزشِ پا یا جنبشِ نگاہ بھی "غیر معتبر" بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے دل کی بات جی بھر کر نہیں کہہ پاتے تھے۔ لیکن جب وہ اس ماحول یا ان تصورات سے کچھ دیر کے لئے نکل پاتے تھے تو ان کی فطری شعریت عود کر آتی تھی۔ خارجی محرکات کے تہیج سے جذبات جوان ہو جاتے تھے اس عالم میں جو بات نکلتی تھی وہ شراب دو آتشہ ہوتی تھی۔ خواہ وہ بمبئی میں رہ کر غزل گوئی ہو یا اعظم گڈھ میں بیٹھ کر "خط نویسی" لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ ان خطوں میں بھی بمبئی کا تصور شریک ہوتا تھا۔ جبھی تو کسی دوسرے کو خط لکھتے وقت شبلی نے کبھی "وانا اول العابدین" نہیں لکھا۔ اور نہ کسی کو اپنے شعر کا مطلب اس طرح سمجھایا کہ "اس نے دیکھا خوب نظر بھر کر نہیں دیکھا" اس بات کا تصور کیا بھی نہیں جا سکتا ہے اور ایک طرح کا "گناہ" بھی ہے کہ اگر شبلی ساری عمر بمبئی ہی میں رہتے یا پیرس میں تو پھر کیا ہوتے ہاں اتنا بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ اسوقت الفاروق والنعمان دیکھنے کو نہ ملتیں، ہاں مشرقی ادب میں حافظ و خیام وغیرہ کے علاوہ ایک نام کا اضافہ ضرور ہو جاتا۔

اب شبلی کے کچھ وہ شعر سنئے جن میں وہ ایک سچے جذبات نگار کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ ان اشعار میں شدتِ تاثر و واقعیت کی اتنی فراوانی ہے کہ پڑھنے والا بھول جاتا ہے کہ یہ وہی شبلی ہیں جنھوں نے الکلام لکھی۔ جو ہر روایت کو درایت کے معیار پر پرکھنے کے قایل ہیں۔ اور جو ہر جگہ عقل کا سہارا لیتے ہیں خواہ وہ خلفائے راشدین کی محفل ہو یا پیرِ روم کی۔ جب وہ محبت کے اسرار خفی الفاظ کے سانچے میں دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ یہ وہی شبلی ہیں جنھوں نے سیرۃ النبی و الغزالی لکھیں اور جن کے نزدیک عقل کا فیصلہ ہر چیز پر مقدم ہے۔ وہ یہاں ساری عقلیت چھوڑ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ :-

اے خوش آں روز کہ رازم فتد از پردہ بروں — از دو سو خلقے و من مے زدہ رسوا باشم

اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھکر کہتے ہیں کہ :-

چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوئے — سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام
جامۂ زہد بہ قامتِ من راست نہ بود — شیشۂ تقوئے سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
کس چہ داند کہ بخلوتگہ آں ماہ تمام — زدہ ام ساغر و بربادِ حریفاں زدہ ام

ذرا اس "زدہ ام ہاں زدہ ام" کا زور ملاحظہ کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خیام عروج نشہ کی کیفیت میں کچھ کہہ رہا ہے۔
ہاں تو اب آپ شبلی کے وہ مرقعے دیکھئے جہاں وہ دل کی دھڑکیں سجا کر پیش کرتے ہیں:۔

پارینہ حدیثے است بہ تسلیم چہ دارد — گویند کہ زیں پیش فغاں ہم اثرے داشت
چندے گرہ کشائے خم زلف بودہ ام، — تا کار رفتہ رفتہ بہ بند قبا رسید
شرم از لب تو مہرِ حیا گرچہ برنداشت — شادم بایں کہ غمزۂ پرفن بہ کار بود
دل متاعیست گرانمایہ بکس نتواں داد — رائگاں گر برد آں ترک بہ یغما چہ کنم
فریب لطف گفتاربت خود کام را نازم — سخن میگوید از اقرار و انکار است پنداری
آدر برم کہ کار ز اندازہ در گزشت — دست دراز گشتۂ و آغوش باز را
اندازہ دانِ حوصلۂ ہر کسے است او — با دیگراں بہ لطف و بہ ما در عتاب بود
حدیث لطف تو باغیر شک نداشت ولے — دلم مرا زرہِ رشک در گماں انداخت
نوازش ہائے او رسمے بود دانستہ ام اما — تنک ظرفے چو من را بوئے از مے نیز بس باشد
چندانکہ رام تر شودم بدگماں شوم، — با آں کہ ایں نوازش خاص است عام نیست

ہر شعر بجائے خود جہانِ معانی و انبوہِ جذبات کا حامل ہے۔ جتنے پرخلوص جذبات ہیں اتنا ہی موثر اسلوب بیان ہے
ہنر شعر اسی قبیل کے اور سنئے۔

قاصد ہزار گونہ سخن در بہانہ ساخت — بیچارہ گشت چوں بہ سر مدعا رسید
بہ سخت جانیِ من کس مباد کز عمرے — مدار زندگیم وعدہ ہائے فرداہست
ایفائے وعدہ ساز کہ ماہم وفا کنیم — آں وعدہ ہا کہ با دلِ ناکام کردہ ایم
بدست آور دن دل یک حدیث لطف میخواہد — بایں کمتر بہا از کف مدہ جنس گرانے را
حدیث دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد — دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را
بے چارہ نکتہ دانِ ادا ہائے ناز نیست — ضایع کمن بہ غیر نگہ ہائے راز دار
افسوں طرازی نگہ ناز را بہ بیں، — چیزے بمن نگفت و مرا گفتگو نماند
ہر چند آں نوازش ظاہر ہماں بجاست — پیداست ایں کہ آں روش پرس و جو نماند

گر عنانِ نگہ شوق بدستم بودے — سہل می بود کہ عشقم بہ تو پیدا نہ شود
لطفے نہ کردۂ و گراں بار منتیم — ما از تو می خریم متاعِ تو بودہ را
چشمش بہ سوئے مانگہِ ناتمام کرد — ساقی بہ جام ریخت مئے نارسیدہ را

ہر شعر جذباتِ کی صحیح جاگتی تصویر ہے۔ خصوصاً پہلا شعر "بیچارہ گشت ۔۔۔۔۔۔" اس سے اچھا پیرایۂ ادا شاید دوسرا نہیں ہو سکتا، بیچارہ کا لفظ جن کیفیاتِ بے چارگی کو ظاہر کر رہا ہے وہ شاید کسی دوسرے لفظ سے ممکن نہیں۔ ایسا ہی تیسرے شعر میں ایفائے وعدہ کے لئے جس علت کا اظہار کیا گیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ محبوب سے ایفائے وعدہ کی صرف اس لئے تمنا کرنا کہ دل سے کئے ہوئے وعدے پورے کئے جا سکیں حسن بیان و حسنِ طلب کی بے نظیر مثال ہے۔ آخری دو شعروں کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے اس لئے کہ دوسرے شعر کو خود شبلی نے عطیہ فیضی کو سمجھایا ہے اور اس طرح کہ اس سے مختصر اور اس سے زیادہ بھرپور انداز میں اب بیان کرنا مشکل ہے اور پہلا شعر اتنا بلیغ واقع ہوا ہے کہ جس کو پڑھکر وجد کیا جا سکتا ہے۔ زبان سے تشریح نہیں کی جا سکتی۔

علاوہ ان سب باتوں کے ایک خاص بات جو ان کے یہاں اس حدیث محبت میں مشترک ہے وہ طرزِ ادا کی معیاریت ہے۔ باتیں وہی ہیں جو ہر دل والا کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے۔ جذبات میں ربودگی و حسن طلب بھی وہی ہے جو اس کا لازمہ ہے لیکن درشتیٔ عشق و ابتذالِ تلذذ کا شائبہ نہیں مل سکتا۔ عام طور پر شعراء جذبات کی رو میں ہر قسم کے کوائف و جذبات کی ترجمانی کر جاتے ہیں۔ کبھی عاشق بے طرح اکڑ جاتا ہے تو کبھی معشوق کو ایسا ہرجائی ثابت کیا جاتا ہے جو ہر رات آغوشِ دیگر بساتا ہے۔ لیکن شبلی ان دونوں باتوں سے بچتے ہیں۔ ان کے یہاں اس درشتگی و ابتذال کے نہ ہونے کی وجہ علاوہ سلامتِ طبع کے ایک اور بھی ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ حصہ "شوخیٔ ادا" سے مملو ہے۔ یہ شوخی وہ متعارف شوخی نہیں جو شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے جیسے اردو میں مومن خاں کے یہاں بلکہ یہ شدتِ جذبات کا نتیجہ ہے۔ اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شبلی مولوی ہوتے ہوئے بھی انسان اور خوش مذاق انسان تھے۔ مولویوں کی صحبت یا ان کے منصبی فرایض ان کے اندر سے یہ لچک و صلاحیت اور پاکیزگی و شعریت ختم نہیں کر سکے ہاں اس کے بے محابا اظہار سے باز رکھا۔ اسی پابندیٔ محدود کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے جذبات میں بے پناہ جوش و گداز پیدا ہو گیا۔ پھر جب اس گداز نے جلوۂ ہائے بمبئی و "سخنہائے شیریں" کی معیت اختیار کی اور اس وادیٔ نغمہ و شباب کی پُرکیف فضاؤں نے اس گداز میں "نقوش رنگا رنگ" کے انعکاسات سموئے تو ان آتشیں جذبات میں اس نتیجۂ امتزاج کے طور پر یہ "شوخی" پیدا ہو گئی۔ اور اسی لئے یہ "متعارف عام شوخی" سے بالکل علٰحدہ ہے۔ جہاں جہاں میں نے اس سلسلہ میں شوخی کا نام لیا ہے اس سے یہی مراد ہے۔

کچھ مثالیں دیکھئے :۔

ره و آئین تقویٰ نیز بدنیست — اگر کارے نہ باشد می تواں کرد

بہ بوسہ دل نوازی کردی اما — ازیں ہم خوبتر کارے تواں کرد

حسن جاں پرور او روز بروز افزوں بود — تا بجائے کہ ز اندازۂ گفتار گزشت

تو بدیں حسن تو نگرچہ زیاں برداری — ایں دو بوسہ را اگر خود نہ شماری چہ شود

از تو ناید گرہ بند قبا وا کردن — اگر ایں عقدہ بمن باز سپاری چہ شود

کام خود خواہی ازاں نو برخوکردہ بہ شرم — باش تا یک دو سہ ساغر زدہ مدہوش آید

حالیا یک نگہِ ناز ازاں سادہ بس است — آں بود نیز کہ بیباک در آغوش آید

ناز عزو حسن مدادش اجازتے — ورنہ سوال بوسہ ما را جواب بود

رسم و آئین ہم آغوشی نمی دانم کہ چیست — دست گستاخ انچہ فرمود است من آں کردہ ام

ہر لحظہ چشم مستِ تو بنیاد می کند — آں شیوہ ہا کہ خود نگہات را بیاد نیست

ساغر بادۂ وطرفِ چمن و لالہ رخے — چوں باینہا فتدم کار بفردا چہ کنم

جائے آنست کہ گلشن دمد از کنج لبم — بوسہ ہا بسکہ بر آں عارض خنداں زدہ ام

لیکن اس سے آگے ان کی شوخ بیانی کی ایک اور منزل آتی ہے۔ جس طرح وہ بمبئی کا نام لیتے ہی سرمست ہو جاتے ہیں اسی طرح وہ جب جذبات کی اظہاری کیفیت سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں تو پھر ان میں ایک شوخ تر بیانیہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس عالم میں وہ دوسرے خیام معلوم ہوتے ہیں۔ اس شوخ بیانی کے سلسلہ میں بار بار شراب کا نام لیتے ہیں اور ہر بار اس ذوق کے ساتھ جیسے کہ اس وقت "غرقِ جام شراب" ہیں۔ بار بار زاہد و صوفی کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں جس طرح ریاض ان پر پھبتی کسا کرتے تھے۔ اپنی بادہ پیمائی و صہبا دوستی کا اس پرزور پن سے ذکر کرتے ہیں جیسے کہ ساری عمر دخترِ رز کی مصاحبت میں گزری ہے۔ یہ انداز جوش و خروش، یہ شراب پینے والوں کا سا تاثر اسی "جذبۂ مجنوں" کا نتیجہ ہے چند شعر سنیئے معلوم ہوتا ہے جیسے حافظ و خیام کی روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے۔

میر سد وقت کہ شبلی بہ بتے بادہ گسار — از در صومعہ تا میکدہ ہمدوش آید

بہ زیر خرقہ اگر بادہ می تواں خوردن — بر آں سرم کہ دگر بارہ پارسا گردم

مستیِ بادۂ الفت نہ باندازہ بود — عجبے نیست کہ رسوائے دو عالم باشم

زاہد بہ وسعت حرم کعبہ ناز داشت — وانجا بقدر یک صنمے نیز جا نہ بود

ایمان ما اگرچہ بہ تقلید بودہ است — طعنہ مزن کہ کفر تو ہم اجتہاد نیست

این نمی دانم کہ گبرم یا مسلماں نیستم — ایں قدر دانم کہ زاہد آنچہ ہست آں نیستم

واعظ ما مرنج کہ ترک سرِ دود مے — شب گر نکردہ ایم سحر می کنیم ما

چوں آگہی کہ فرصتِ عہدِ شباب چیست — مے خور دگر سخن ز عذاب و ثواب چیست

از ہمہ کار جہاں دل مئے و مستی بگزید — بعد عمرے کہ در اندیشۂ ہر کار بماند

سبحہ داشتم از جملۂ اسباب ورع — رفت از یادم و در خانۂ خمار بماند

آں شوخ را بصومعہ ہا چوں گزر فتاد — یکبارہ عشق ہائے حقیقی مجاز بود

ہر کے چوں شیخ میدانِ ریا را مرد نیست — اندریں فن زحمتِ بسیار می باید کشید

کار مستوری و شاہد طلبی ہر دو خوش است — شکر ایزد کہ ہم ایں کردم و ہم آں کردم

شب وصلے و شغلے ایں چنیں صد رہ بفیضم باد — کہ تو بند قبا را عقدہ بر بستی و وا کردم

عالیا من ہم چو زاہد پارسائی شیوہ ام — بادہ خوردن در شبابم اتفاق افتادہ بود

شیوۂ رندی چناں شبلی بآب و رنگ کرد — گوئیا زیں پیش ہم کردہ بسا ماں کردہ بود

شاعری میں مثالیہ بیان ایک خاص چیز ہے۔ سیدھی سی بات میں کسی مماثل واقعہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کر دینا اسکے حُسن میں چہار چند اضافہ کر دیا کرتا ہے۔ شبلی کے یہاں ایسی تمثیلات و تشبیہات میں بڑی مدرت ملتی ہے۔ ان کی تشبیہات میں عجیب جدت ہوتی ہے جو ان کی فطری شوخی سے مل کر شعر کے حُسن کو دو بالا کر دیتی ہے، کچھ مثالیں دیکھئے:۔

چنیں از کوئے او قاصد گراں رفتار می آید — ز دستش نامہ ام در راہ افتاد است پنداری

برلب او نشانِ بوسہ بود — ہم چو نقشے کہ بر نگیں باشد

دو زلفش دام بر دوش و دو چشمش در کمیں سازی — بدیں ساماں ہمی آید کہ صیاد است پنداری

شام وصلش ہست و ایمن گشتہ ام از بیم صبح — آفتاب آوردم و در خانہ پنہاں کردہ ام

متاعِ گر بدست آساں فتد قدرے نمی ارزد — بہ او دل را سپردن خواستم اول بہا کردم

آمد و از ما دل ما صبر و سکوں می طلبد، — شاہ بنگر کہ بآئینِ گدا می آید،

بادہ را نیست خود از نقل گزیر — بوسۂ از پس دشنام خوش است

مے نیرزد بہ جوئے مسند جم — دیں حکایت زلبِ جام خوش است

یہ ہیں شبلی جو اپنے زمانہ کے محقق، مفسر، مورخ، محدث، فقیہ، متعلم اور نہ معلوم کیا کیا تھے۔ اس زمانہ میں اور بہت سے عالم بھی تھے، لیکن جس طرح کوئی دوسرا شخص قسطنطنیہ کے کتب خانے میں سارا سارا دن صرف ایک قہوہ کی پیالی پر نہیں بسر کر سکتا تھا، اسی طرح ایسا بھی کوئی "معصوم صفت" شخص نہیں ملتا جو ان جیسی پابند زندگی

وگرانبار محدودیت کے باوجود اس قدر صاحب ذوق رہے۔

خورشید الاسلام صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شبلی پہلے یونانی تھے جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے اگر وہ انشا پرداز نہ ہوتے تو مصور ہوتے"۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اگر شاعر نہ ہوتے تو یقیناً مصور ہی ہوتے۔ خواہ یونانی ہوتے یا نہ ہوتے۔ اس لئے کہ ان کی انشا پردازی میں چند مخصوص خطوط کو علیحدہ رکھ کر اور کوئی دل والی بات نہیں ملتی۔ بیشک ان کی انشا پردازی بھی ایک امتیازی بانکپن کی حامل ہے لیکن وہ بانکپن نگہ ناتمام سے بھی کمتر ہے۔ اسلئے کہ اس جولانگاہ میں ضوابط حدود کا پاسبان ہر قدم پر نگراں رہتا ہے۔ ہاں شاعری ان کی سچی فطرت کی بے لاگ نمایش گاہ ہے۔ اسی لئے اگر کوئی شخص صرف الفاروق یا النعمان وغیرہ ہی تک شبلی کو پڑھے اور سمجھے تو یقیناً وہ "ادبی کفر" کا مرتکب ہوگا۔ اس لئے کہ شبلی کا اعجاز نطق و علمیت وہاں ہے لیکن ان کی روح یہاں۔ اور یہی ان کی شاعری کی قدر و قیمت ہے۔

شبلی اپنے رنگ کے بے مثل فنکار ہیں۔ انھوں نے اشعار میں احساسات و جذبات کی بے لاگ تصویریں پیش کی ہیں۔ ایسی تصویریں جو حسین ترین رنگوں سے مزین ہیں اور جن کے امتزاج میں انھوں نے اس مذاق سلیم کا ثبوت دیا ہے جو کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آپ پورا مجموعہ فارسی غزلیات کا پڑھ جائیے ایک شعر میں بھی اس حدیثِ شوق کے علاوہ کسی دوسری بات کا بیان نہیں ہوگا۔ یہی بات ان کے مذاق سلیم کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

اتنے اشعار پڑھنے کے بعد ممکن ہے کہ مزید اشعار بار خاطر ہوں۔ لیکن لذتِ احساس سفارشی ہے کہ چند اشعار اور نقل کئے جائیں۔ اس لئے کہ اب کون فارسی مجموعوں پر نظر ڈالتا ہے اور کون ان "افسانہ ہائے پارینہ" کو دیکھنا گوارا کرتا ہے۔

آج کے دور میں تو ہر شخص ایک "جہاد چنگیزی" میں مصروف ہے، ستاروں سے آگے جہاں تلاش کرنے کی سعی میں مستغرق۔ یہ بات بجائے خود بری نہیں لیکن ان میں اکثر وہ ہیں جو اس "عزم فلک سیر" کے باوصف زمین کی حقیقتیں بھی مکمل طور پر نہیں جانتے ہیں۔ چہ جائیکہ "آداب پرداز" ——— فرہاد نے تو ایک ہی نہر نکالی تھی۔ لیکن یہاں ہر شخص فرہاد کا بھائی بننے کے لئے بیتاب ہے اور جوئے شیر لانے کا مدعی ——— اگرچہ دوسری طرف یہ بھی کہہ رہا ہے کہ صحرائے نجد سے زیادہ کارخانوں کی ضرورت ہے اور اس لئے کسی "ابوالمجنوں" یا کسی "کوہکن" کی گنجایش نہیں۔ بہرحال چند شعر اور سنیئے اور اس کے بعد میں بھی رخصت ہوتا ہوں۔

باد صبح امروز از ہر کوچہ مشک افشاں گزشت — شب مگر مشاطہ زلف او پریشاں کردہ بود

انچہ از گرمی ہنگامۂ محشر گفتند — ہست بزمے کہ تو صد بار بہم برزدۂ

خنک آنکس کہ بہ ذوق نظرے شد قانع — وائے برمن کہ صد اندیشۂ باطل دارم

کوشش ناخن تدبیر چہ سودم بخشد — من کہ یک رشتۂ و صد عقدۂ مشکل دارم

زور سر پنجۂ مژگانِ تو گر ایں باشد — اے بسا فرقہ کہ محتاج رفو خواہد شد

پیکر آرائے ازل طلعت زیبائے ترا — نقش می بست وہم از ذوق تماشامی کرد

باہمہ دعوئے تمکیں نتواں خواست زمن — کہ تو از پردہ بروں آئی و برجا باشم

حشر ایں گرمیِ ہنگامہ کجا داشت مگر — پردہ برداشتہ اند از رخ تا بانے چند

در کار عشق دیدہ وری شرط بودہ است — ہر کس نظر کشود و تماشا بما رسید

ہمیں تنہا نگاہ لطف را لذت شناس استی — بہ پرس از تشنہ کامانِ ستم ذوق عتابش را

از بس گنہ پسندی من کاتب عمل — در نامہ ام فزود گناہ نبودہ را

عمر آخر گشت و در اندیشہ ام کیں کار را — ہم بہ عنوانِ دگر آغاز می بایست کرد

با بداں ہم چشم لطفے اے چمن پیرائے صنع — آنچہ با گل کردہ با خارے می بایست کرد

منبر و محراب درس عشق را شایستہ نیست — شرحِ اسرار نہاں بر دارمی بایست کرد

بہ پیش غیر بدشنامم امتیاز دہ — روا مدار کہ خود سود من زیاں گردد

نگہ کاش آں قدر سرمایہ کردے از تماشایش — کہ می آمد بکار ما دلِ در روزِ ہجراں ہم

با ما بہ صلح ساز ولیکن نہ ہمچو دوش — کز تیر ہائے غمزہ یکے در کماں نہ بود

میداند اینقدر کہ زجاں نیستم دریغ — ہر چند در وفا بہ منش اعتبار نیست

آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ شبلی کو خود بھی اس "مئے بینا گداز" کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ اسی احساس کا تقاضا تھا کہ وہ معاصرین میں سے کم کو خاطر میں لاتے تھے اور اسی احساس کے تحت وہ دوسروں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کو "کچھ اور" سمجھا جائے۔

در سخن با خاکیانِ ہند می سنجی مرا — ہے چہ میدانی کہ ایں فن را چہ ساماں کردہ ام

در حیرتم کہ پاکیِ گفتارش از کجاست، — شبلی مگر ز مردم ہندوستاں نبود

اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ ان کو "حاملانِ عرش" کی صف میں جگہ دیجئے یا ان کی اپنی خواہش کے مطابق .....

..... اور یہ مولانا پر منحصر ہے کہ وہ روز بازپرس ایسے "سعادت آثار" حضرات سے بازپرس کریں یا چھوڑ دیں لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ وہ اس امر کو کبھی معاف نہیں کریں گے کہ ان کو "جنت رنگ و بو" بمبئی میں کیوں نہیں دفن کیا گیا تاکہ "یہ خاک وہیں پہونچ جاتی جہاں کا خمیر تھا"

رشید حسن خاں شاہجہاں پوری

عربی حروف تہجی کا تلفظ

حرف نام ہے ایک نشان یا علامت کا جو کسی سادہ و مفرد آواز کو ظاہر کرے۔ اس تعریف کے پیشِ نظر عربی حروف پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اُن میں بعض حروف پر تو یہ تعریف صادق آتی ہے اور بعض پر نہیں۔ وہ حروف جو مفرد آواز کو ظاہر کرتے ہیں یہ ہیں:۔ ب - ہ - ز - ح - ط - ی - ف - ر - ت - ث - خ - ظ -

جن کا تلفظ یوں ہوتا ہے :۔ بَ - ہَ - زَ - حَ - طَ - یَ - فَ - رَ - تَ - ثَ - خَ - ظَ -

حروف ذیل ایک مستقل لفظ کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

ا - ج - د - و - ک - ل - م - ن - س - ع - ص - ق - ش - ذ - ض - غ -

اور ان کا تلفظ یوں ہوتا ہے :۔

الف - جیم - دال - واؤ - کاف - لام - میم - نون - سین - عین - صاد - قاف - شین - ذال - ضاد - غین -

ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم و تعلم کے لئے تلفظ کا یہ طریقہ مفید نہیں ؛ اگر ہم الف کو الف نہ کہکر اَ کہیں یا جیم کو جیم نہ کہکر جَ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اسی پر باقی حروف کو قیاس کر لیجیے۔

اس سے دو فایدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ تمام حروف تہجی میں مطابقت پیدا ہو جائے گی اور دوسرے بچوں کی بہت سی وہ قوت جو ہجے کرنے میں صرف ہو جاتی ہے بچ جائے گی۔ اسے یوں سمجھئے کہ "اکبر" کے مروجہ ہجے اس طرح کئے جاتے ہیں:۔ الف کاف زبر اَک - بے - رے زبر بر۔ مگر مجوزہ طریقہ اختیار کرنے پر بچے سے پوچھا جائے گا کہ لفظ اکبر کن مفرد آوازوں پر مشتمل ہے تو وہ بتائے گا اَ - کَ - بَ - رَ - اس طرح اُردو اور ہندی بچوں میں کوئی فرق نہ رہیگا

مجوزہ طریقہ اختیار کرنے پر اُن زبانوں کے شعر و ادب کو جن کا رسم الخط عربی ہے کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ حروف کی شکلیں جوں کی توں برقرار رہیں گی۔ کرنا صرف اس قدر ہوگا کہ حروف کو پڑھنے کا جو طریقہ چلا آرہا ہے اُسے ترک کر دینا ہوگا۔ عربی رسم الخط عبرانی رسم الخط کے تدریجی بگاڑ سے پیدا ہوا ہے۔ اگر آپ عربی اور عبرانی حروف کے ناموں کا مقابلہ کریں (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۱) تو معلوم ہوگا کہ نو نام ایسے ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں یعنی:۔ الف - واؤ - کاف - میم - نون - عین - صاد - قاف - شین - اور تقریباً اتنے ہی نام عبرانی کے ایسے ہیں جنھیں عربی میں مختصر کر دیا گیا ہے :۔

عبرانی:۔ بیت۔ جمل۔ دالت۔ زائیں۔ حیط۔ طیط۔ ید۔ لامد۔ راس۔ تاؤ۔

تلفظ عبرانی:۔ بے۔ جمّ۔ جم زائی۔ حے۔ طے۔

تلفظ عربی:۔ با۔ جیم۔ دال۔ زا۔ حا۔ طا۔ ئی۔ لام۔ را۔ تا۔۔۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اہل عرب نے بقیہ حروف کے نام کیوں مختصر کئے۔

عربی کے بہت سے حروف معنی رکھتے ہیں مثلاً عین (ع) کے معنی آنکھ ہیں۔ اور نون (ن) کے معنی مچھلی ہیں۔ ان ناموں کی کیا اصلیت ہے۔ تحقیق کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ عربی اور عبرانی دونوں کا ماخذ فنیقی رسم الخط ہے جو حضرت عیسیٰ سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے فلسطین اور شام میں رائج تھا۔ اور یہ ایک تصویری لکھائی تھی۔ ملاحظہ ہو (نقشہ نمبر۲)۔ فنیقی حروف نے کس طرح بدلتے بدلتے عربی حروف کی شکل اختیار کر لی۔ اسے سمجھنے کے لئے یہ مثال کافی ہوگی:۔

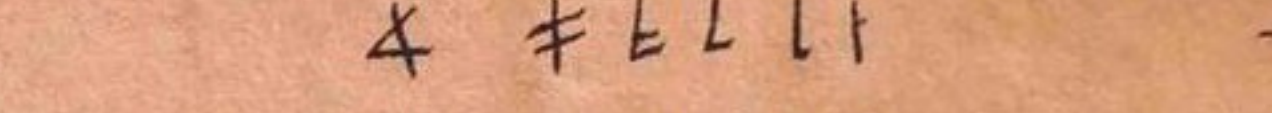

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶

مندرجہ بالا اشکال میں الف کا ارتقاء دکھایا ہے۔ الف کے معنی بیل تھے۔ اُس کی پہلی شکل بیل کے چہرے سے مشابہ ہے جس میں سینگ اور کان سب ہی نمایاں ہیں۔ بعد کو اس میں تبدیلی ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ صرف "۱" رہ گیا۔ عین کے معنی آنکھ ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے اُس کے لئے آنکھ کی تصویر بنائی جاتی ہوگی۔ نون کے معنی مچھلی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے نشان کی بدلی ہوئی صورت ہے جو مچھلی سے مشابہ تھا۔ ملاحظہ ہو (نقشہ نمبر۲) پس اس طرح حروف کی شکلیں تو بدل گئیں مگر نام باقی رہ گئے۔ بہرحال کوئی وجہ نہیں کہ اس نشان کو "ا" الف کہا جائے جبکہ بیل کا چہرہ نہیں رہا۔ اور کیا وجہ ہے کہ ہم "ع" "ن" کو عین اور نون کہیں جبکہ بحالت موجودہ آنکھ اور مچھلی سے مشابہ نہیں ہیں۔ جب فنیقی حرف کی اشکال باقی نہ رہیں تو اُنکے نام کیوں باقی رکھے جائیں۔ جب فنیقی حروف کی شکلیں بدل گئیں تو اُن کے نام کیوں نہ بدل دئے جائیں، اور جب فنیقی حروف کی اشکال باقی نہ رہیں تو اُنکے نام کیوں نہ بدل دئے جائیں۔ اور جب فنیقی حروف کی اشکال مختصر ہوگئیں تو اُن کے نام کیوں نہ مختصر کر دئے جائیں۔

فنیقی رسم الخط عربی اور عبرانی کے علاوہ یونانی رسم الخط کا بھی ماخذ تھا۔ چنانچہ عبرانی اور یونانی حروف کے ناموں میں بڑی مشابہت ہے۔ ملاحظہ ہو (نقشہ نمبر۱)۔ جب یونانی رسم الخط روم پہونچا تو وہاں کے لوگوں نے حروف کے شروع کی آوازیں لے لیں اور بقیہ کو حذف کر دیا۔ اہلِ روم نے یہ بھی معلوم کیا کہ حروف صحیح کا تلفظ بغیر حروف علت کے نہیں ہو سکتا۔ پس اُنھوں نے ایسے نام اختیار کئے جن میں سے کچھ آواز آسی پر ٹوٹتے ہیں۔ جیسے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ جی۔ پی۔ ٹی۔ وی۔ کچھ اے پر جیسے اے۔ جے۔ کے اور بعضوں کے شروع میں اے کو جوڑا ہے جیسے ایف۔ ایچ۔ ایل۔ ایم۔ این۔ ایس۔ ایکس اور بعضوں کے شروع میں آ کو جیسے آر اور بعض کے آخر میں دو دو

حروفِ علت ہیں جیسے وائی (و + ا + ی) اور کچھ بعینہ الفاظ ہیں جیسے ڈبلو اور زیڈ۔

	A	J · IL		F
	F	BC · DG · P · T · V		H
حروف علت	I			L
	O			M
	V			N
	W			S
حروف صحیح	Z		R Y	X

مگر اس معاملہ میں ہمیں باہر والوں سے زیادہ اپنے ملک والوں کی پیروی کرنا چاہئے۔ ہندوستان کی جتنی لکھائیاں ہیں وہ براہمی رسم الخط (شہنشاہ اشوک کے زمانہ کی لکھائی) سے نکلی ہیں اور خود براہمی رسم الخط فنیقی سے ماخوذ تھا۔ جب ہمارے ملک کے عالموں نے فنیقی حروف پر غور کیا تو اُنھیں معلوم ہوا کہ بہت سی آوازوں کے لئے فنیقی میں نشانات نہیں ہیں۔ پس اُنھوں نے فنیقی کے ایک ایک نشان سے کئی کئی نشان اخذ کئے۔ مثلاً :-

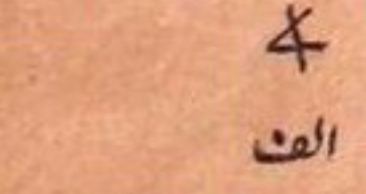

الف

اور فنیقی حروف کے شروع کی آوازیں لے کر سب کو سادی آواز آپر توڑا۔ چنانچہ ہندی لکھائیوں کا یہی حال ہے اور ہمیں بھی یہ چاہئے کہ بجائے "رومن" طریقہ اختیار کرنے کے یعنی حروف صحیح میں آگے پیچھے حروفِ علت جوڑنے کے اور بجائے مختلف آوازوں کے اُنھیں صرف ایک آواز آپر توڑیں۔ آپر توڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عربی کے (۱۲) حروف ایسے ہیں جن کے نام سادی آواز آپر ٹوٹتے ہیں (جدول نمبر ۱) اگرچہ ہم انھیں فارسی قاعدے کے مطابق اَے پر توڑتے ہیں، جیسے بے (ب) ہے (ہ) زے (ز)۔ ہمیں ان ۱۲ حروف کو عربی قاعدے کے مطابق اور بقیہ کو ہندی قاعدے کے مطابق پڑھنا چاہئے یعنی اس طرح

اَ - بَ - جَ - دَ - ہَ - وَ - زَ - حَ - طَ - یَ - کَ - لَ - مَ - نَ - سَ - عَ - فَ - حَس

قَ - رَ - شَ - تَ - ثَ - خَ - ذَ - ضَس - ظَ - غَ -

مجھے امید ہے کہ اہلِ علم اس پر غور کریں گے۔

اب ذیل کے نقشوں کو ملاحظہ فرمائیے :-

نقشہ نمبر (۱)

حروف کے نام

	(عربی)	(عبرانی)	(یونانی)	
	الف	الف	الفا	(۱)
(۱)	با	= بے = بیط	بیٹا	(۲)
(۲)	جیم	= جم = جمل	گاما	(۳)
(۳)	دال	دالط	ڈیلٹا	(۴)
	ہا	ہے	ایپسائلوں	
	واؤ	واؤ	واؤ	
(۴)	زا	= زائی = زائیں	زیٹا	(۵)
(۵)	حا	= حے = حیط	ایٹا	(۶)
(۶)	طا	= طے = طیط	تھیٹا	(۷)
(۷)	یا	ید	آئی اوٹا	(۸)
	کاف	کاف	کاپپا	(۹)
(۸)	لام	لامد	لامڈا	(۱۰)
	میم	میم	مو	
	نون	نون	نو	
	سین	سایخ	سی	
	عین	عین	اومائکرون	
	فا	فے (پے)	پائی	
	صاد	صاد	سان	
	قاف	قاف	کوپپا	(۱۱)
(۹)	را	راس	رہو	
	شین	شین	سیگما	(۱۲)
(۱۰)	تا	تاؤ	تاؤ	

عربی حروف کے دس نام عبرانی الفاظ کے آخری حصوں کو حذف کرنے سے حاصل ہوئے ہیں اور تقریباً اتنے ہی حروف دونوں میں ہم آواز ہیں یعنی الف۔ واؤ۔ کاف۔ میم۔ نون۔ عین۔ صاد۔ قاف۔ شین۔ یونانی کے بہت سے حروف میں سادی آواز اَ کا اضافہ کیا گیا ہے (۱-۱۲)

(نقشہ نمبر ۲)

عبرانی حروف کے نام	دوسری زبانوں کے مقابل	معنی	فنیقی حروف کی اشکال بعد	قبل	تشریح
الف	اشوری ایپو	بیل	∢	∀	بیل کا چہرہ جس میں سینگ اور کان سب ہی نمایاں ہیں۔
بیط	عربی بیت	گھر		⌂	ایستادہ خیمہ
جمل	عربی جمل	اونٹ		Z	اونٹ کی گردن
دالط		دروازہ		◁	درِ خیمہ
ہ ہے		کھڑکی	𐤄	日	
واؤ		کیل	۲ ۲	♀	ابراہمی ؤ کا نشان۔ اسکا مقابلہ عربی "و" سے کرئے۔
زائیں		ہتھیار	𐤆	∧	پیکان یعنی تیر کا پھل
حیط	عربی حائط۔ حاطہ	جنگلہ جھاڑی	𐤇	⫫	
طیط		روٹی ؟		⊕	صلیب بنی ہوئی روٹی جسے عیسائی گڈ فرائڈے کے دن کھاتے ہیں
ید	عربی ید	ہاتھ		☡	
کاف	عربی کف	ہتیلی		⊁	⊁ چینی رسم الخط میں دائیں اور بائیں ہاتھ کا نشان
لامد	اشوری لام	ہل		L	مصری ہراغلفی میں ہل کا نشان
میم	عربی ماء	پانی	𐤌	≈	≈ " " پانی کی لہر
نون	عربی نون	مچھلی	𐤍	⌐	مچھلی کا دہانہ اور پشت
سایخ		روک۔ اڑانا		⌸	قائدِ عرش یعنی وہ ستون جس پر مصری عقیدے کے مطابق آسمان ٹکا ہوا ہے
عین	عربی عین	آنکھ	○	⊙	پتلی
پے (ف)	عربی فم	دہانہ	𐤐	⊐	
حس			𐤑		نیزہ ؟
قاف	عربی قفا	گدی	⊕	♀	سر کا پچھلا حصہ۔ کھڑا خط گردن ہے۔
ریش	عربی راس	سر		9	انسانی چہرہ
شین	عربی سن۔ جمع اسنان	دانت		W	
تاؤ	عربی تواء	صلیب کا نشان	×	+	اس کا حزقیال باب ۹ آیت ۴ میں ذکر ہے۔

نقشہ نمبر ۲ "عربی رسم الخط کا ماخذ فنیقی"۔ یہ نقشہ ایک عرصہ کی تحقیق کا نتیجہ ہے جس کا تفصیلی ذکر میں کسی آیندہ مضمون میں کروں گا۔ فی الوقت دو کتابوں کا حوالہ کافی ہوگا یعنی
1. Phoenicia By Kreongi Rawlinson
2. Genenias, Helvan Chaldee Lexicon
ان میں سے پہلی کتاب فنیقی حروف کی اشکال کا اور دوسری عبرانی حروف کے معلوں کا ماخذ ہے۔ ملحوظ رہے کہ عبرانی اور فنیقی زبانوں میں بہت کم فرق ہے۔

اسحاق محمد

انیس کی مرثیہ نگاری

اور

"فاروقی صاحب کی ستم ظریفی"

(بہ سلسلۂ ماسبق)

فاروقی صاحب ایک جگہ (ص ۴) فرماتے ہیں کہ میر انیس سب سے بڑے مرثیہ گو ہیں لیکن دوسری جگہ (ص ۱۶) ارشاد ہوتا ہے کہ مداحی کو عروج پر پہونچانے والے مرزا دبیر تھے اور مرقعہ نگاری کو کمال تک پہونچانے والے میر انیس تھے لیکن یہ بتانے میں پہلوتہی کرتے ہیں کہ مرقعہ نگاری سے اُن کا مطلب کیا ہے۔ اگر مرقعہ نگاری کسی واقعے یا جذبے کو اس حسن و خوبی سے بیان کرنا ہے کہ اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے یا شاعر کے حسب منشا ہم شدت و قوت سے متاثر ہوں تو پھر انیس کے متعلق یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ اُن کے یہاں صحیح جذبات نگاری کا فقدان[1] ہے اور اُنھوں نے واقعیت کا بہت کم لحاظ کیا ہے (ص ۲۵)۔ مرقعہ نگاری رزم کی طرح بزم کا بھی ایک جزو ہے لیکن اس ضمن میں فاروقی صاحب نے سوائے مذمت کے انیس کی تعریف سے اکثر و بیشتر احتراز کیا ہے۔ اُن کا قول فیصل یہ ہے کہ:-

"میر انیس کے بیانات میں کبھی کبھی حقیقت نگاری کی جھلک بھی نظر آتی ہے مگر اس میں عامیانہ نفسیاتی باتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا"

یہ صفحہ ۳۲ پر ہے۔ لیکن صفحہ ۳۳ پر عنوان "رسوم رزم نگاری" کا افتتاح وہ اس عبارت سے کرتے ہیں:-

"میر انیس کا کمال یہ ہے کہ وہ بزم و رزم دونوں کے ماہر ہیں"۔

یہ خود اُن کی رائے ہے کیونکہ اس کے بعد مولانا شبلی کی رائے درج کی ہے۔ بعد ازاں حسب دستور سابق میر انیس کی تنقیص اور مولانا شبلی کی تردید کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے اور اپنے ابتدائی قول کے برخلاف رزم کا ایک کونا (رجز) میر انیس سے چھین کر مرزا دبیر کے حوالے کر دیا ہے۔ رفتہ رفتہ انیس اور دبیر دونوں کے کمالات پر یہ کہکے خاک ڈال دی ہے کہ:-

---

[1] مرقعہ نگاری اور جذبات نگاری میں فرق ہے۔ اُس کا تعلق عرض سے ہے، اِس کا جوہر سے اور اسی فرق کو پیش نظر رکھ کر فاروقی صاحب نے انیس کو مرقعہ نگار کہا ہے۔ (نیاز)

"انیس اور دبیر دونوں نے رزمیہ شاعری کے حق کو ادا کیا (کا حق ادا کیا) لیکن حقیقت سے کسی کو سروکار نہ تھا"
یہاں سے فاروقی صاحب نے ایسی بحث چھیڑ دی ہے جس کا تعلق آرٹ اور حقیقت نگاری سے ہے لیکن جو کچھ فرمایا ہے اُس کی تائید میں کوئی سند پیش کرنا تو کیسا اپنی کوتاہ نظری کی نمائش کی ہے۔ رزم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ:-

"کسی عالم کا سماں کھینچنے کے لئے شاعر کیا طریقے اختیار کرتا ہے؟ اس کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ کسی واقعہ کے جزئیات کی مبالغہ آمیز تصویر ہمارے سامنے آئے۔ دوسرا یہ کہ واقعہ کی حقیقی تصویر کھنچ جائے۔ اول قسم کی تصویر کھینچنا محض آرٹ ہے اور دوسرے قسم کی تصویر پیش کرنا حقیقت نگاری ....." (ص ۳۳)

نتیجہ یہ نکالا ہے کہ میر انیس کے کلام میں حقیقت نگاری برائے نام ہے، اکثر و بیشتر مبالغہ اور آرٹ ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایپک یا رزمیہ شاعری میں مبالغہ اور حقیقت کی تفریق ہی لایعنی ہے۔ ایسی شاعری میں مبالغہ آرٹ کا ویسا ہی ایک جزو ہے جیسے حقیقت نگاری۔ ایپک شاعری میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ حقیقت کیا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر نے حقیقت کو کس نگاہ سے دیکھا اور کس موثر پیرایہ میں بیان کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ عام صداقت اور شاعرانہ صداقت کا فرق ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ محض بیان واقعہ شاعری نہیں ہے، ایسا کرنا سائنس کا کام ہے۔ شاعرانہ صداقت یہ ہے کہ ہم واقعات کے جذباتی تاثرات کو دیانتداری سے بیان کر دیں، یہ بتا دیں کہ ہم پر اُس واقعہ کا کیا اثر ہوا، کیا خوشی کیا غم حاصل ہوا، ہمارے جذبات امید یا دہشت، حیرت یا مذہبی احترام میں کیا ہیجان و اشتعال پیدا ہوا۔ لہٰذا شاعری میں صداقت کی پہلی پہچان صداقت یہ نہیں کہ اشیاء بجائے خود کیا ہیں بلکہ یہ کہ ان میں کیا حسن ہے، کیا رمزیت ہے، کیا دلکشی ہے کیا معنویت ہے۔ ٹریجڈی (المیہ) اور ایپک (رزمیہ) شاعری کے مشترک اور منفرد عناصر کی طرف توجہ دلانے سے بھی فاروقی صاحب کا قول غلط ثابت ہو جائے گا۔

اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ارسطو کی شعریات (Poetics) ابتدا اُسی سے کی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹریجڈی کسی ایسے عمل کی نقل ہے جو اہم (Important) ہے، سالم (Entire) ہے اور معقول حجم[1] (Proper magnitude) رکھتا ہے۔ اس کی زبان مزین (Embellished) اور مسرت

---

[1] اثر صاحب نے Proper magnitude کا ترجمہ "معقول حجم" کیا ہے، حالانکہ ارسطو نے اسکی جو صراحت کی ہے، وہ یہ ہے کہ "قصہ نہ اتنا طویل ہو کہ ذہن انسانی بیک وقت اس کا احاطہ کرنے سے معذور رہے، اور نہ اتنا مختصر کہ اسکے اجزاء علٰحدہ علٰحدہ نہ سمجھے جا سکیں، دوسرے یہ کہ ہیرو خواہ ایپک کا ہو یا ٹریجڈی کا اسے نہ ایسا انسان ہونا چاہئے کہ وہ بالکل بے عیب ہو اور نہ ایسا کہ اس میں کوئی خوبی ہی نہ پائی جائے، بلکہ ان دونوں کے درمیان کا انسان ہونا چاہئے جس کا انجام باوجود بلند اخلاق رکھنے کے اپنی کسی مخصوص کمزوری کی وجہ سے ٹریجک ہو۔ اگر ارسطو کی اس صراحت کو سامنے رکھا جائے تو مرثیہ نہ ایپک رہتا ہے نہ ٹریجڈی، کیونکہ اس کا ہیرو ایک ایسا انسان اعلیٰ ہے جس میں خوبیاں ہی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور کمزوری کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ Proper magnitude کا ترجمہ "مناسب و متداول قدر" زیادہ مناسب ہوگا۔ (نیاز)

مہیا کرنے والی (Pleasurable) ہوتی ہے مگر اس مسرت کے ذرائع مختلف حصوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اس کا طرز ادا بیانیہ (Narrative) نہیں ہوتا بلکہ اسٹیج اور ایکٹنگ سے متعلق ہوتا ہے جس کو ایکشن (اداکاری) کہتے ہیں۔ ٹریجڈی کا مقصد رحم اور دہشت کے ذریعہ سے ایسے جذبات کی تصحیح اور تہذیب ہے۔ مسرت مہیا کرنے سے ایسی زبان مراد ہے جس کی آرائش میں روانی (Rhythm) موسیقی (melody) اور موزونیت (Metre) سے کام لیا گیا ہو۔۔۔

ارسطو کے اقوال کا اہم جزو وہ ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ شاعر اس کا پابند نہیں کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا ہے وہی بیان کرے بلکہ وہ بھی بیان کر سکتا ہے جو وقوع پذیر ہو سکتا تھا یا جس کا وقوع پذیر ہونا قرائن یا امکانات کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہی شاعر اور مورخ میں فرق ہے۔ پھر کہتا ہے کہ بعض ٹریجڈیوں میں کوموس (Comos) بھی پایا جاتا ہے یعنی کورس (Chorus) اور ایکٹروں کا مل کر آہ وزاری (Lamentations) کرنا۔

ٹریجڈی کے برخلاف ایپک شاعری میں نقل کا آلہ بیان ہے، لیکن اس میں بھی ڈرامائی شان ہونا چاہئے، اسکو بھی سالم (Entire) ہونا چاہئے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آغاز (Beginning) ہو، درمیانی کڑیاں (Middle) ہوں اور اختتام (End) ہو۔ اس کو بھی سبق آموز (Moral) یا مصیبت آلودہ (Disastrous) ہونا چاہئے۔

ایپک شاعری کو ٹریجڈی پر اس لحاظ سے ترجیح ہے کہ اس میں مختلف واقعات کو سمویا جا سکتا ہے اور یکسانیت کی اُکتاہٹ پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ٹریجڈی میں حیرت کا عنصر ضروری ہے لیکن ایپک اس سے بھی آگے بڑھتی ہے اور اپنے میں بعید از قیاس (Improbable) اور ناقابل یقین (Unbelievable) باتوں کو بھی شامل کر لیتی ہے کیونکہ اس طرح انتہائی حیرت رونما ہوتی ہے۔ شاعر کو چاہئے کہ ایسے ناممکنات (Impossibilities) کو جو بظاہر قرین قیاس ہیں اُن باتوں پر ترجیح دے جو ممکن ہوتے ہوئے بھی مشتبہ یا مستبعد (Improbable) ہیں۔

ارسطو کے وقت سے عہد حاضر تک ایپک کے مفہوم یا خصوصیات میں کوئی تغیر نہیں ہوا، البتہ اُس کے عمل اور اطلاق کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ ناقدوں نے اُس کے مجوزہ اصول کو تسلیم کر لیا ہے اور بقول مولانا شبلی شاعری میں اصلیت و واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کو بیان کردہ واقعات کا یقین ہے کہ نہیں۔ بالفاظ دیگر ایسی شاعری آرٹ ہے، محض واقعات کا قلمبند کرنا نہیں ہے، لہذا فاروقی صاحب کی طرح جو بھی آرٹ کو حقیقت یا واقعیت کے گز سے ناپے گا بھٹکتا پھرے گا۔ جیسا کہیں عرض کر چکا، شاعری میں حقیقت کی جگہ شاعرانہ صداقت کارفرما ہوتی ہے۔ جو یہ امتیاز قایم نہیں رکھ سکتا اُس کو شاعری پر بحث کرنے کا کوئی حق نہیں۔

یہ بھی دھیان رہے کہ جتنی ایپک نظمیں ہیں اور جس قوم سے متعلق ہیں وہ بالعموم وہاں کے دیوتاؤں یا بلند مرتبت

قومی سورماؤں کے کارنامے ( ) ہیں اور ان سب میں مافوق الفطرت اور حیرت انگیز عناصر بھی کم و بیش پائے جاتے ہیں، نیز ان افسانوں یا اساطیر کو مذہبی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

ایپک شاعری کے جو خصوصیات بیان کئے گئے، میر انیس کی شاعری اُن تمام لوازم کو پورا کرتی ہے۔ اس کا ہیرو وہ شخص ہے جس کی عظمت دنیائے اسلام کو تسلیم ہے بلکہ دوسرے مذہب والے بھی ادب و احترام کرتے ہیں اور اُس کی قربانیوں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور سراہتے ہیں۔ انیس مورخ نہیں شاعر ہیں۔ حسین کے کردار کے انسان کا خاص حالات میں کیا طرز عمل ہوگا، کیا برتاؤ ہوگا، کیا جذبات ہوں گے یا کیا ہونا چاہئے اس کی بے مثل مصوری انیس سے شروع ہو کر انیس پر ختم ہو گئی۔ دوسرے بڑے شاعروں مثلاً ملٹن کی طرح اُس کے کلام میں بھی خامیاں اور کمزوریاں ملیں گی مگر من حیث المجموع اُس کی شاعرانہ عظمت کو اُن سے کوئی صدمہ نہیں پہونچتا۔

مردہ دلوں اور ادبی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے کا بہرہ نہ رکھنے والوں کا ذکر نہیں میں نے غیر مذہب کے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ انیس کی نوشتہ رزم و بزم کو پڑھ پڑھ کر جھومے ہیں اور مصائب کے بیان پر آبدیدہ ہو گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن تھا اگر انیس کے قلم نے حقایق میں رعنائی و رنگینی و دل گدازی نہ بھری ہوتی اور حقیقت عروس نو کی طرح سجی سجائی (نہ کہ اپنے "جامۂ اصلی" میں) گلفروش نظارہ نہ ہوتی اور روح کی گہرائیوں میں تلاطم برپا نہ کرتی، جمالیاتی احساس کو بیدار نہ کرتی۔ ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے پنڈت برشن نراین در اور پنڈت برج نراین چکبست آں جہانیاں کو دیکھا ہے وہ میرے قول کی تصدیق کریں گے کہ اُنھیں انیس کے کلام سے کیسا عشق تھا۔ چکبست کی شاعری میں تو انیس کے مطالعہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ یہ شرف فاروقی صاحب کے لئے اُٹھ رہا تھا کہ انیس کی شاعری کو اس قدر حقیر سمجھیں کہ یورپ کی معمولی شاعری کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے بے اختیار مسٹر ٹی کے کرشن مینن کا ایک قول یاد آتا ہے جو ایک مضمون میں پیشتر نقل کر چکا ہوں۔ کچھ برس ہوئے اُنھوں نے ایک انجمن کے سامنے عمر خیام کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا تھا جس کے دوران میں کہا تھا:۔

"مجھے فریق مخالف سے کوئی پرخاش نہیں، وہ کہتا ہے تو یہ کہ شیکسپیر اور کالیداس کی تصانیف باد ہوائی ہیں اُن میں کام کی ایک بات بھی نہیں۔ مجھے بھی حق ہے کہ اپنی پوری قوت سے اعلان کروں کہ ان ملہم شاعروں کے ذہنی افکار نے بحر تخیل کے ہر ساحل کو چھو لیا ہے ..... زندۂ جاوید قدما اپنے ایوان تعمیر کر چکے، وہاں جدید بالشتیوں کی رسائی نہیں نہ اُن کے حملے کارگر ہو سکتے ہیں۔ اُن کی قلابازیاں اور ہتھکنڈے قدما کو اُن کے مستقل مندروں سے نکال نہیں سکتے نہ اُن متاخرین احسان مندوں کے دلوں سے خارج کر سکتے ہیں جن کی نشوونما ایسی مقدس فضا میں ہوئی ہے"

فاروقی صاحب کی ایک دوسری حرکت نہ بوجھی ملاحظہ ہو۔ اس دھن میں کہ ایپک شاعری کا ترجمہ رزمیہ غلط ہے اور

ایپک میں رزم کا ہونا لازم نہیں اور خود اعتراف کرتے ہوئے کہ ہومر سے لے کر ملٹن تک کی ایپک نظموں میں رزم کا کافی حصہ ملتا ہے فرماتے ہیں کہ ملٹن نے اپنے نظریہ کے مطابق جو کامل ایپک لکھی ہے وہ (Paradise Lost) نہیں بلکہ (Paradise regained) ہے! میں نے تو آج تک کوئی نقاد دیکھا نہیں جو فاروقی صاحب کا ہم خیال ہو۔ فی الحال صرف ولیم ہنری ہڈسن (William Henry Hudson) کا قول نقل کرنا کافی ہوگا:۔

In Paradise Lost-English poetry possesses one of the supreme pieces of epic poetry

(انگریزی شاعری میں (Paradise Lost) رزمیہ ادب کا ایک اعلیٰ ترین شاہکار ہے)۔ ایپک سے رزم کا خیال اب دست و گریباں ہے کہ کارلایل نے اس کو "زرہ پوش" (Iron mailed epic) کا خطاب دیا ہے۔

اگر فاروقی صاحب کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رزمیہ شاعری وقیع نہیں جس میں حقیقت نگاری کی جگہ حقیقت آرائی ہو تو انیس پر ہی موقوف نہیں دنیا بھر کی کوئی رزمیہ شاعری درخور ستایش نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسی شاعری میں حیرت خیزی و دہشت انگیزی کی صفت ہونا ضروری ہے، مبالغہ ناگزیر ہے، محض حقیقت نگاری سے اس مقصد کی تشکیل نہیں ہو سکتی اپنی تائید میں فاروقی صاحب رستم اور سہراب کا معرکہ لائے ہیں جس طرح میتھو آرنلڈ نے نظم کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ معلوم ہوتا دو مقابل کے انسان لڑ رہے ہیں۔ بالکل درست کیونکہ سہراب رستم کا لڑکا تھا گو ہنگام کارزار دونوں اس رشتہ سے لاعلم تھے، اگر ایسی حالت میں برابر کا مقابلہ نہ دکھایا جاتا اور سہراب بآسانی مغلوب ہو جاتا تو شاعری کا نقص تھا، آرٹ کی خامی تھی۔ خدا معلوم فاروقی صاحب کیا جواب دیں اگر دریافت کیا جائے کہ امام حسینؑ کے رونے کو تو جا بجا بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے اور خاکم بدہن بطریق استہزا و تمسخر "بین" کہا ہے، لیکن رستم سے گودرز کی سینہ کوبی و آہ و زاری، منہ پیٹنے اور سر کے بال نوچنے کی بابت کیا ارشاد ہوتا ہے۔ جب اُسے علم ہوا کہ اپنے ہی بیٹے کو تیغ کے گھاٹ اُتارا ہے؟

مگر یہی نہیں کہ حسین کے پائے صبر و استقلال کو لغزش نہیں ہوتی بلکہ مردانہ وار مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ:۔

حق کی پہچان نہیں فتح و ظفر پر موقوف — سر کہیں ہوتے ہیں یہ معرکے میدانوں میں
ساکھ اسلام کی بگڑی ہوئی دیکھی جو اثرؔ — تُل گئے مال و منی تیغ کی میزانوں میں

یہ شاندار سبق ملتا ہے کہ ؎ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔

یہ ولولہ جوش زن ہوتا ہے کہ حق باطل کے مقابلہ میں سب کچھ لٹا دے مگر جھکے نہیں[2]۔

---

[1] خود ملٹن کا خیال یہی تھا جو صرف فاروقی صاحب نے لکھا ہے بلکہ ملٹن کے ہر سوانح نگار اور نقاد نے ظاہر کیا ہے۔ (نیاز)

[2] یقیناً امام حسین جھکے نہیں، لیکن مرثیہ میں کہیں کہیں ان کا جو کیرکٹر پیش کیا گیا ہے، اس میں ایسے تاثرات غم و الم بھی پیش کئے گئے ہیں جو غالباً جھکنے سے زیادہ معیوب ہیں۔ (نیاز)

اس نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے کہ حق کی حمایت میں انسان کس قدر ہمت و جرأت کا ثبوت دے سکتا ہے کیسی کیسی ایذائیں اور مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے اور باطل کس قدر دنائت، بزدلی، مظالم اور شقاوت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ ان حقایق اور راستیوں کے اُجاگر کرنے کو شاعر کا قلم حقیقت کی بنیاد پر جتنی عظیم الشان عمارت کھڑی کرے مستحق آفریں ہے نہ کہ مستوجب ملامت۔ شاعر آرٹ کے معجزے دکھاتا ہے تاریخ نہیں دُہراتا۔ اس مبالغہ آمیز بیان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ حق و صداقت کے نقوش دلوں پر گہرے، مرتسم ہوں، ظالم سے بیزاری اور مظلوم سے ہمدردی پیدا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اصل واقعات کربلا کا سب کو علم ہے یہ انیس کے کمال فن کا جادو ہے کہ اس علم کے باوجود سامع یا قاری کے دل پر جیسے جذبات و کیفیات چاہتا ہے طاری کر دیتا ہے۔

انیس کی شاعری میں ایپک[1] کے تمام اوصاف اپنے پورے عروج پر موجود ہیں مگر وہ شخص ایسی شاعری کی خوبیوں کا اندازہ اور اُس کی قدر کیا کر سکتا اور رحظ کیا اُٹھا سکتا ہے جو رزمیہ شاعری میں بھی حقیقت نگاری اور ایسی حقیقت نگاری کا متوقع ہے جو مبالغہ و آرائش سے بھی پاک ہو۔ ظاہر ہے کہ اُسے ہر منہر عیب نظر آئے گا۔

فردوسی ایک جگہ کہتا ہے:-

چقا چاق خنجر بگردوں رسید زمیں خوں شد و خوں بجیحوں رسید

حقیقت کی روشنی میں دیکھئے تو مبالغہ کی حد نہیں، نہ تو خنجر کی خچ خچ آسمان تک پہونچتی ہے۔ نہ زمین خون ہوتی اور خون جیحون میں بہتا ہے۔ لیکن شدت کا رن پڑا اس کے اظہار کا کس قدر نادر اسلوب ہے۔ (انیس کا ایک مصرع بھی یادگار ہے:- "دکھتی تھی زمیں رن کی دڑیڑوں سے ہو کے")۔ لیکن انیس گھمسان کی لڑائی کی تمہید میں اگر کہتا ہے کہ:-

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک قرنا پھنکی کہ گونج اُٹھا دشت و در تک
شور دُہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

تو رزمیہ شاعری کے جوہر شناس فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"ان تمام باتوں میں ایک بات حقیقت سے قریب ہے اور وہ دشت کا گونج اُٹھنا ہے باقی تمام مبالغہ اور آرٹ ہے اور اسی طرح کی مثالیں مولانا (شبلی) نے فوج کی طیاری، سپاہیوں کی آمادگی جنگ، حملہ کا زور و شور اور فوجوں کی ہل چل کے سلسلہ میں بھی دی ہیں اور یہ سب کی سب دور از قیاس باتوں پر مبنی ہیں"

---

[1] ایپک شاعری میں بھی Tempo magnitude ضروری ہے اور یہ چیز مرثیہ میں نہیں پائی جاتی جس کی صراحت اس سے قبل ہو چکی ہے۔ (نیاز)

جس مبالغہ، آرٹ اور دور از قیاس باتوں کی فاروقی صاحب مذمت کر رہے ہیں وہی ایپک شاعری کا سامان آرائش ہے[1]۔ مراثی پر کیا موقوف ہے، دنیا کی ہر رزمیہ شاعری سے مبالغہ آمیز اور دور از قیاس باتوں کا ایک طومار جمع کیا جا سکتا ہے تاہم اُن شاہکاروں کی عظمت شمہ برابر کم نہیں ہوتی بلکہ اُن کی عظمت کا راز اسی چکاچوند پیدا کرنے والی، خون کو آتش سیال بنا دینے والی اور دلوں میں جذبات مہیبت یا رحم و ہمدردی اُکسانے والی شاعری میں مضمر ہے، بشرطیکہ جو حالت یا سماں شاعر نے دکھایا ہے یا جس جذبے کی مصوری کی ہے اُس کی شدت و قوت کا اظہار بلحاظ موقع و محل ہو۔ اگر ایسا ہے تو رزمیہ شاعری بعید از قیاس ہوتے بھی حقیقت سے ہمکنار ہے، کیونکہ شاعرانہ صداقت کی ترجمان اور شاعر کے فن کا حسین مرقع ہے۔

فاروقی صاحب کو مراثیِ انیس میں کوئی درس اخلاق نظر نہیں آتا۔ اُن کا فرمانا ہے کہ لکھنؤ کے شیعوں کے آداب رسم و رواج کو امام اور اُن کے ساتھیوں پر عاید کیا گیا ہے، وہ (انیس) امام کا صحیح اخلاق اپنے سامعین کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ امام کے اخلاق کو اپنے سامعین کے اخلاق کی سطح پر لے آنا چاہتے تھے۔ اگر مراثیِ انیس کے پڑھنے سے یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہو جاتا تو ایک شیعہ کی حیثیت سے اپنی قسمت پر ناز کرتا اور فرقۂ شیعہ کو مبارکباد دیتا کہ تم سورماؤں کی قوم ہو (a nation of hero) مگر افسوس، چہ نسبت خاک را با عالم پاک! کوئی پوچھے کہ جب مرثیے میں صرف وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جو فرقۂ شیعہ کے عام دستور و رواج و آداب کے مطابق ہیں تو ان مراثی کی اثر اندازی اور ولولہ[2] خیزی کا راز کیا ہے اور ہر شخص جو ادبی ذوق رکھتا ہے بلا تفریق مذہب و ملت اُن سے اس قدر متکیف اور متاثر کیوں ہوتا ہے۔

فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ انیس نے حضرت امام کو شیعیان لکھنؤ کا جلیس بنا دیا لیکن انیس کو جب دوستداران حسین میں وہ شان بندگی نظر نہیں آتی تو افسوسناک لہجے میں کہتا ہے:۔ "دنیا سے اُٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود"۔

فاروقی صاحب نے خاص طور سے اُس مرثیے پر توجہ مبذول کی ہے جو اس مصرع سے شروع ہوتا ہے:۔

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"۔ میں اسی سے اقتباسات پیش کر کے فیصلہ اہلِ نظر پر چھوڑ دوں گا کہ حسینؑ تو بڑی چیز ہیں اُن کے رفقا کے کردار اور اُسوۂ حسنہ کی جھلک فرقۂ شیعہ بلکہ عام انسانیت کے لئے مشعل راہ ہے یا عمومی شیعوں کے دستور و رواج و آداب و اخلاق کی نقل ہے:۔

---

[1] دور از قیاس ہونا اور مبالغہ کا بھی دور از قیاس حد تک پہونچ جانا ایپک شاعری کے منافی ہے کیونکہ یہاں بھی وہی Proper Mean کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ (نیاز)

[2] یہ راز اس کا حسن بیان یا زبان و بیان کی خوبی ہے۔ (نیاز)

۱۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی یادِ خدا و ذوقِ عبادت میں کمی نہ ہو:۔

مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو، اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

۲۔ راہِ حق میں جان کی بازی لگانا وجہِ مسرت و شادمانی ہے۔ روزِ شہادت یومِ وصال ہے:۔

چہرہ خوشی سے سُرخ ہے زہرا کے لال کا گزری شبِ فراق دل آیا وصال کا

۳۔ موت سے دوچار ہیں تاہم رفقائے حسین کی یہ شان ہے:۔

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رخوں پہ نور خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاضِ حق سُناس اولوالعزم ذی شعور خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور،
کانوں کو حُسنِ صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ زباں کو مزا ملے

اُسی کے ساتھ:۔ پرہیز گار و زاہد و ابرار و نیک خو

۴۔ اور باغِ رسالت کے نونہال؟

پھولے سماتے تھے نہ محمد کے گلعذار
دولھا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلے کا ہار جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار

کتنے شخص ہیں جو تصدیق کریں گے کہ یہ کیریکٹر شیعیانِ لکھنؤ پر منطبق ہوتا ہے بجز اس کے کہ فاروقی صاحب کی پوچ باقی پر انگشت بدنداں ہوں۔

کربلا والوں کی نماز کی کیا شان تھی اس کی طرف ایک دوسرے موقع پر اشارہ ہوگا۔ میرا یہ بھی ارادہ ہے کہ میر انیس کے کسی ایک مرثیے کو لے کر ذرا تفصیل سے تبصرہ کروں اس ضمن میں بھی یہ جملہ امور آجائیں گے۔

(باقی) مرزا جعفر علی خاں اثر

انیس کی مرثیہ نگاری

از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (لکھنؤ یونیورسٹی)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب میں جدید ترین اصول کو سامنے رکھ کر انیس کی مرثیہ نگاری اور شاعری پر بسیط تبصرہ کیا ہے اور انیس کی صحیح شاعرانہ پوزیشن بتائی ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

اشتہار بازی

اشتہار پر جو ایمان نہ لائے وہ کافر ہے یہاں کافر سے مراد کسی کا کفر نہیں میرا تکیہ کلام ہے۔ اشتہار سے مراد زندہ اور زندہ در گور جو ہو چکے ہیں اور باقی جو رہ گئے ہیں۔ ان کے لئے بقول اخبار والوں کے "اشتہار کے لئے جگہ خالی ہے" مجھے دواؤں کے اشتہار سے زیادہ دلچسپی ہے اس لئے نہیں کہ میری بعض کمزوریوں کی دوا ان اشتہارات میں ملتی ہیں بلکہ ان اشتہارات میں دواؤں کی کرامات کا حال پڑھ کر مجھ میں اکثر یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اس مبارک مرض میں میں بھی مبتلا ہوتا کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ اشتہاری مرض مجھے لاحق ہو گیا، دواؤں کا اس طور پر اشتہار دینا کہ امراض سے ہمدردی پیدا ہو بجائے اشتہار دینے والے کا بڑا کارنامہ ہے جس کی قرار واقعی داد صرف وہ مریض دے سکتے ہیں۔ جو ان اشتہارات کے شکار ہوں یا وہ تندرست جو گیدڑوں کے پکے گانے پر سر دھنتے ہیں۔

میری طبیعت کی اس رفتار سے آپ میرے لاشعور کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ وہ لاشعور جسکی برکتیں آجکل کے شعر و ادب میں اور جس کی جھلکیاں اشتہارات میں ملتی ہیں۔ جس کی بنا پر آج کل کے شعر و ادب کے دور کو دور لاشعور کہیں تو بجا ہے۔ اشتہار دینے والوں نے ہماری اس لاشعوری کو پہچانا اور وہ دن بھی دور نہیں جب اس سے پولیس والے بھی واقف ہو جائیں گے۔

جن چیزوں کا اشتہار دیا جاتا ہے ممکن ہے وہ ویسی ہوں جیسا کہ اشتہار میں بیان کیا گیا ہے لیکن جس طرح خرافات کثرت استعمال سے درجۂ ادب یا نعرۂ جنگ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح اشتہارات میں جھوٹ کی کثرت یا جھوٹ کا مسلسل اشتہار ہماری اکثر معتقدات کا سرچشمہ بن جاتا ہے بات منوانے کا ایک گر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جھوٹ کثرت سے بولو بہانگ دہل بولو بات مان لی جائے گی اور یہ سوائے اشتہار کے کسی طرح ممکن نہیں۔

ایک صاحب کی زبان سے ایک بے سر و پا بات سن کر میں نے اس کی تصدیق کرنے میں تامل کیا، لیکن جب انھوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ یہ کہا کہ واقعہ جھوٹ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ انھوں نے اسے چھپا ہوا دیکھا ہے تو مجھے ماننا ہی پڑی صحیح ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جن کی بات پر جملہ کو وقعت دی جا سکے۔ یہ لوگ اشتہارات کو وقعت دیتے ہیں بالخصوص دواؤں اور بیویوں کے اشتہارات کو، بیویوں کے اشتہارات سے میری مراد ہماری آپ کی بیویاں نہیں ہیں بلکہ وہ ہیں جو ان بیویوں کی جگہ لینے کے درپے ہیں۔

ہماری شاعری میں "اشتہار بازی" کے دو بڑے اہم نمونے ملتے ہیں۔ غزل اور قصیدہ، قصیدہ میں ممدوح کی غزل میں

محبوب کی تعریف کی جاتی ہے اور جیسا کہ ہم مشرق کے مسکینوں کا دستور ہے تعریف اور مذمت کے حدود میں اپنے آپ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ غزل اور قصیدہ میں محبوب اور ممدوح کے جن اوصاف حمیدہ کا ذکر جس بدخواہی سے کیا جاتا ہے ان کو الفاظ کے جامہ یا تصویر کے پیرہن میں منتقل کیا جائے تو بعض ایسے کارٹون نظر آئیں گے جن کو دیکھ کر آپ مشکل میں پڑ جائیں گے کہ یہ ہیئت محبوب کی ہے یا ممدوح کی یا شاعر کی۔

غزل اور قصیدے اب نا مقبول ہو رہے ہیں، مگر ممدوح یا محبوب سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا ہے، چنانچہ غزل اور قصیدہ کی جگہ اب ان افسانے اور نظموں نے لے لی ہے جن میں انسانی کمزوریوں کے مقابلہ میں عقل و اخلاق کے لئے بے بس یا لاطایل ہونے کا اشتہار دیا جاتا ہے ان افسانوں اور نظموں میں جو باتیں جس طرح بیان کی جاتی ہیں ان سے قطع نظر ان کے مصنفین کو اس کی شدید ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ انسانیت کا حشر کچھ ہی ہو خود ان کا نشر خاطر خواہ ہو اور اسکے لئے مقدمہ نگار تلاش کئے جاتے ہیں۔

"پیشہ ور مقدمہ بازوں کی طرح پیشہ ور مقدمہ نگار بھی ہوتے ہیں۔ مقدمہ باز اور مقدمہ نگار دونوں میں ایک خاصیت مشترک ہوتی ہے۔ دونوں شرفا کے ناموس کے لاگو ہوتے ہیں۔ مقدمہ باز اپنے حریف کو رسوا کرتا ہے، مقدمہ نگار ان ارباب فکر و نظر کو رسوا کرتا ہے جن کے افکار سے ملتے جلتے مقدمہ نگار کے ہیرو کے خیالات ہوتے ہیں یا جن سے اس نے بقول شخصے "سرقہ کیا ہوا ہوتا ہے"۔ چنانچہ دونوں نظم اور نثر کے مجموعوں پر مقدمے لکھے یا لکھوائے جاتے ہیں ان کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فضائے شعر و ادب میں ایک دمدار ستارہ بڑے آب و تاب سے نمودار ہوا ہے جس کے ایک سرے پر صاحب مجموعہ ہیں اور دوسرے پر مقدمہ نگار اور مشیت الٰہی ساز گار رہی تو اس ستارہ کی دم سے ٹکرا کر دوسرے ثوابت و سیارہ پاش پاش ہو جائیں گے بقول ایک اشتہار کے "پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"۔

کچھ تو میری عادت اور کچھ وقت گزاری کا مشغلہ میں اسٹیشن پر ادھر اُدھر چسپاں اشتہارات ضرور پڑھتا ہوں، سو ایسے اسٹیشنوں کے اشتہارات کے جن کے پلیٹ فارم کے شیڈ میں ایسے کبوتر آباد ہوں جن کی سخن فہمی عالم بالا کی بنا پر شکار کیا جانا ممنوع ہے، مجھے ان اشتہارات سے بڑی دلچسپی ہے، جو ریلوے پولیس کے دفتر کے باہر تختوں پر چسپاں ہوتے ہیں۔ یہ اشتہارات بالعموم تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو گم شدہ عزیز کی تلاش کے دوسرے کسی منچلے مفرور کے اور تیسرے پولیس کی سرپرستی میں کسی دنگل کے سب سے پہلے میں دیکھتا ہوں کہ ان کے لئے کتنے انعامات مقرر ہیں اور یہ انعامات مجھے مل جائیں تو میں کتنے لاشعوری مطالبے کر سکتا ہوں یعنے مجھے اپنے ذاتی استعمال کے لئے کتنی وہ دھوتیاں مل سکتی ہیں جن کی نمائش کپڑے کے مشہور ہندوستانی کارخانوں نے رنگ برنگ کی دلکش ساری پوش تصاویر میں کی ہیں جو اسٹیشن کی دیوار پر جا بجا نصب ہوتی ہیں، مردانی دھوتی میں ملبوس۔ دو مختلف اشتہاروں میں آپ نے دو قوی ہیکل گاؤدی مردوں کی تصویریں دیکھی ہوں گی ایک تو ساریوں سے لدے ہوئے ایک بیل و ایک خر و خراماں کے ساتھ رہنموں ہیں اور دوسرے انھیں کے بھائی ایک سہی قد کے پاس انتہائی

انداز کے ساتھ اکڑوں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ انعامات کا موازنہ ایک دوسرے سے کرنے کے بعد میں اس امکان پر غور کرتا ہوں کہ یہ انعامات میرے بجائے کسی دوسرے کو ملیں تو مجھے کتنی جلن ہوگی اور کسی کو نہ ملیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس کے بعد دل میں یہ بات آتی ہے کہ گم شدہ عزیز منچلے، مفرور اور دنگل کے پہلوان میں سے کس کے حالات یا حلیہ مجھ سے ملتا ہے لیکن مطالعہ میں دماغ اور مشاہدہ دونوں میں اس کا بڑا لحاظ رکھتا ہے کہ مطالعہ میں دماغ اور مشاہدہ میں دل پر ضرب کاری نہ لگنے پائے چنانچہ بیک نظر میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ چند در چند مصروفیتوں اور ان سے زیادہ معذوریوں کی بنا پر پولیس کے دنگل میں بطور امیدوار شریک نہیں ہو سکتا اور یہ اشتہار دینے والوں کا صریحی تصور ہے کہ وہ ایسا اشتہار دیں تاکہ میرے بہت سے بھائی بندوں پر صادق نہ آئے باوجود اس کے کہ میں اور میرے بہت سے بھائی بند اشتہاری ہونے اور بننے کی استعداد بھی رکھتے ہیں اور حوصلہ بھی!

میں اسے لیتھو کا کمال سمجھتا ہوں کہ اس کے ذریعے اور صرف اس کے ذریعہ ہندوستانی پہلوانوں کی ایسی عدیم المثال شبیہیں ہم کو نظر آجاتی ہیں جن کے سر پر سینگ اور بازوؤں پر پر لگا دئے جائیں تو وہ پولیس کے دنگل سے راجہ اندر کے اکھاڑے میں پہونچ جائیں۔ گم شدہ عزیزوں کے بعض اشتہارات اور تصویروں کو مطالعہ کرنے کے بعد میں عموماً اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ پسماندگان کو ان کی بازیافت کی زیادہ فکر نہیں ہے، اور بفرض محال فکر ہے تو میں نہیں وہ غلطی پر ہیں، گم شدہ عزیزوں کی بھی تین اقسام ہیں۔ بچے، نوجوان، اور بوڑھے بچوں کے بارے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے نوجوانوں کی میں تعریف کروں گا یا جیسا کہ انگریزی کا ایک محاورہ ہے میں ان کے اعزاز میں اپنی ٹوپی یا آپ کی پگڑی اُتار لوں گا۔ بشرطیکہ کم سے کم میں نے کوئی ایسی اشتہاری دوا نہ استعمال کی ہو جس کا تعلق بالوں کے عدم وجود سے ہو، نوجوانی کھوئے جانے کا وجود ہی بجائے خود کھوئے جانے کا اعلان یا اشتہار ہے جسے عقل کی پاسبانی راس نہیں آتی اور پولیس کی نگرانی اور سرگردانی مبارک ہوتی ہے بوڑھوں کے کھوئے جانے پر البتہ مجھے سخت اعتراض ہے ان کی تلاش میں سرگرداں ہونا بے وقوفی اور بدمذاقی ہے یہ کھوئے کب جاتے ہیں کہ ان کی تلاش کی جائے لیکن بعض ناگفتہ بہ وجوہ کی بناء پر مجھے بوڑھوں سے ایک نسبت خاص ہے اس لئے میں ان کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ ان کے لئے دو خطرے بڑے ہیں ایک اشتہاری ادویات اور اشتہاری بیویاں لیکن ان میں کون کسکا نتیجہ ہے۔ یہ بوڑھوں کے طے کرنے کی بات ہے۔

بچپن میں مجھے بیچم صاحب کی گولیوں کے اشتہار سے بڑی دلچسپی تھی۔ طفلی کی جہاں بہت سی رنگینیاں ختم ہوئیں وہاں بیچم صاحب کی گولیوں کا اشتہار بھی مجھے داغ دے گیا اس زمانہ میں مجھے انگریزی آتی نہ تھی اور اُردو کے املا کی اصلاح کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی، بیچم صاحب کے نام کو ہر طرح سے پڑھتا تھا، املا صحیح پڑھنے کے لئے میں نے اپنے مولوی صاحب سے پوچھا تو اول تو انھوں نے اس سے اختلاف کیا کہ میں اسٹیشن جاؤں اس لئے کہ کیا معلوم کسی دن انجن کا نشانہ غلط بیٹھے اور پٹریوں پر چلنے کے بجائے پلیٹ فارم پر دوڑ پڑے، دوسرے یہ کہ اسٹیشن پر نامحرم تصاویر ہوتی ہیں ایک دن انھیں

گولیوں کا اشتہار ایک اُردو اخبار میں نظر آیا۔ میں نے مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ پہلے تو غور سے سارا اشتہار پڑھ ڈالا اس کے بعد بولے اس میں کیا قباحت ہے یہ دیکھو لکھا ہے کہ مروڑ کی دوا ہے، میں نے کہا مروڑ کو فارسی میں کہتے ہیں پیچش میں نے کہا پیچش اس کا مصدر ہے، پیچیدن، میں نے کہا پیچیدن، پیچیدن سے پیچم، میں نے کہا پیچم، بولے بس پیچم صاحب کی گولیاں، پھر نہایت فاتحانہ لیکن ہمدردانہ انداز سے بولے آخر اس میں دقت کیا تھی، تم کیا پڑھتے تھے، میں نے کہا کہ میں بھی قریب قریب یہی پڑھتا تھا بولے آخر میں بھی تو سنوں میں نے کہا میں تو اس نے کو پیچم پڑھتا تھا بولے یہ بھی صحیح ہے بعض نسخوں میں یوں بھی آیا ہے۔

عرصہ ہوا کہ ایک اُردو جنتری میں میں نے نوشیروانی خضاب کا اشتہار پڑھا تھا۔ ایک بہت چوڑا چکلا رعب دار چہرہ اور اس سے زیادہ چوڑی چکلی گھنی داڑھی نصف سیاہ اور نصف سفید جیسے جغرافیہ کی کتاب میں زمین اور سورج کے مقابلے بنا کر دن اور رات کا ظہور دکھایا جاتا ہے میں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ نوشیرواں کا دار و مدار تمام تر داڑھی پر تھا۔ البتہ یہ طے نہ کر سکا کہ داڑھی کا مدار نصف سیاہ اور نصف سپید پر تھا یا عدل کا۔

لکھنؤ کے سب سے آباد اور پر رونق بازار میں ایک دن ایک شخص نظر آیا۔ لمبی گھنی داڑھی۔ آدھی بالکل سیاہ اور آدھی بالکل سفید دونوں ہاتھوں سے باری باری نصف داڑھی کو دائیں بائیں جنبش دیتا چلا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا پہلے ایسی تھی، اب ایسی ہی لڑکوں اور بے فکروں کا ایک ہجوم ساتھ تھا اب معلوم ہوتا تھا جیسے کسی قومی جلسہ میں کوئی گھن گرج ریزولیوشن پاس کیا جا رہا ہو۔ ہم کو یہ بتایا گیا ہے کہ دُنیا میں ایک نیکی کی جائے تو آخرت میں ستر نیکیوں کا ثواب ملے گا یہ تو میرا عقیدہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا تجربہ یہ ہے کہ آخرت میں ایک گناہ کرنے سے دنیا میں ستر سے کہیں زیادہ عذاب اُٹھانے پڑ رہے ہیں۔

یہ باتیں یقیناً میرے لاشعور میں رہی ہوں گی کہ ایک بار میں نے اپنے زمانہ بے شعوری میں رنگین پتنگی کاغذ پر ایک اشتہار چھپا ہوا دیکھا کہ ایک گھڑی خریدنے پر بارہ نادر تحفے بطور ہدیہ پیش کئے جائیں گے جن کی فہرست باتصویر بھی دی گئی تھی۔

گھڑی آئی، تحفے بھی ملے۔ ایک سے ایک بڑھ کر گھڑی کا یہ عالم تھا کہ اس کو دیکھ کر عشق، برسات کے اس درجہ پر پہونچ گیا تھا۔ جہاں پر اس طرح کی گھٹا چھا جاتی ہے "جو کھلتی ہے نہ برستی ہے" اتنے میں پیچھے سے ایک ڈراؤنی آواز آئی — یہ چوری کہاں کی؟ نتیجہ میں سزا بھگتنی پڑی — اسی دن سے اس دُنیائے فانی کا قایل ہو گیا، جہاں چوری کرنے اور لوٹے جانے میں تفریق نہیں کی جاتی۔

میں نے اشتہارات کا مطالعہ کافی کیا ہے۔ ہندوستانی اشتہارات کا اور ہندوستان سے باہر کے اشتہارات کا بھی ہندوستانی اشتہار میں ہندوستانی شاعرانہ غیر ذمہ داری کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہمارے اشتہار دینے والے مال کی

خوبی پر اتنا بھروسہ نہیں رکھتے جتنا ہماری آپ کی سادہ لوحی، اوہام پرستی اور مشاعرہ دوستی پر ولایت کے مشتہرین نے کاروبار کی دُنیا میں اپنے مال کی خوبی اور اپنی کاروباری امانت و دیانت کا سکہ بٹھا رکھا ہے ان کا مال اور انکا اشتہار دونوں مستند، ہم ولایت کی اقوام کے بارے میں ممکن ہے اچھی رائے نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس بدنام ترین قوم کی مصنوعات کے بہترین ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ اپنے تجارتی مال اور تجارتی ساکھ کی اتنی ہی حفاظت و احترام کرتا ہے جتنا کبھی ہم اپنے مذہب و اخلاق کا کرتے تھے۔ کاروبار کے معاملے میں ان کا شخصی اور اجتماعی اخلاق ہم سے کہیں بلند ہے ہم کاروبار شروع کرتے ہیں تو پہلے خریدار کو آخری خریدار قرار دے کر اسی سے سارا نفع وصول کر لینا چاہتے ہیں۔ برخلاف ولایت والوں کو جو اپنے خریدار کو اپنا سرمایہ بھی سمجھتے ہیں اور اشتہار بھی اور کسی خریدار کو اپنا آخری خریدار نہیں سمجھتے۔

ہم اشتہار دیتے ہیں تو سارا زور قلم پر دیتے ہیں، وہ زور بھی جو ایمان پر دینا چاہئے تھا اب معلوم ہوتا ہے جیسے سارے ملک کو کٹ مرنے یا بغلیں بجانے کی دعوت دے رہے ہیں بالفاظ دیگر گویا مشاعرہ کے لئے کلام بلاغت التیام تصنیف فرما رہے ہیں۔ یہ باتیں تو ہوئیں ہمارے آپ کی اشتہارات سے متعلق جن میں بہت سی چھوٹ گئیں بعض ایسی تھیں جن کا تذکرہ نزاکت یا خطرے سے خالی نہیں۔ اب میں آپ سے پوچھوں گا کیا آپ نے کبھی ان اشتہارات کا بھی تصور کیا ہے جو زمان و مکان کے بے پایاں، بے پناہ، بے نام و نشان، باہمہ و بے ہمہ وراء الورا میں نظر آتے ہی محسوس یا محسوب ہوتے ہیں۔ جن میں کبھی ہم سب کچھ ہوتے ہیں اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ جن میں ہر حقیر اور ہر عظیم ہیچ جسے انسان نے دریافت کیا جس میں انسان کھو گیا اور جس میں انسانیت برافگندہ نقاب ہو گئی۔

ہولناک جنگیں، سیلاب، وبائیں، قحط، حسد، فریب، ظلم، ہوس ایک طرف، دوسری طرف عظیم الشان قربانیاں برگزیدہ حوصلے، بے پایاں، عمل، علم و عقل، حسن و عشق کارفرما نظر آتے ہیں۔ ہم ان کی کس طرح تعبیر کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں اور کس نتیجہ پر پہونچتے ہیں؟

تاریخوں کے اوراق فطرت کے مظاہرے، صنادید کے آثار، سائنس کے انکشافات، عقل و عقاید کی کش مکش، فن کی عظمتیں، لاف و دانش، نفع عبادات، اللہ کی کتاب، انسان کا حاشیہ یہ سارا عالم ایک بے پایاں گراں مایہ مستقل اور مستند اشتہار ہے کیوں کس کا، کس لئے؟ یہ آپ بتائیں۔

رشید احمد صدیقی

"نگار" کے فائل

جولائی ۱۹۲۲ء سے دسمبر ۱۹۴۹ء تک کے مکمل فائل ساڑھے ستائیس سال کے، اگر کسی صاحب کو درکار ہوں تو ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کریں۔ جواب کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا ضروری ہے:۔

ایم۔ یو۔ صدیقی۔ شیل پٹرول کمپنی۔ کوہاڑا پیرا اسٹینڈ بریلی

اشارات

(غالب کے مطالعہ کے لئے)

غالب شکن — یگانہ چنگیزی کا مختصر رسالہ ہے جو ۱۹۳۵ء میں آرمی پریس دیال باغ آگرہ سے چھپکر شایع ہوا ہے اس کے تعارف میں غالب کا یہ شعر کافی ہے :—

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

روح کلام غالب — المعروف بہ تفسیر کلام غالب بار اول مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۵ء یہ مرزا کے پورے اردو دیوان کی تضمین ہے جو مرزا عزیز بیگ المتخلص بہ مرزا سہارنپوری نے کی ہے شروع میں نظامی بدایونی کا مقدمہ ہے جس میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "روح کلام غالب" کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار کے معنی و مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے "روح کلام غالب" کو دیوان غالب کی تمام شرحوں پر فوقیت حاصل ہے۔

غالب نامہ — شیخ محمد اکرام کی لایق ستایش تصنیف ہے جو ۱۹۳۶ء میں پہلی بار مرکنٹایل پریس لاہور میں چھپی ہے مالک رام ذکر غالب کے مصنف نے اپنے ماخذ میں اس کی تصنیف کا ۱۹۳۷ء اور پریس کا نام مسلم گجرات پریس سورت لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے مسلم گجرات پریس سورت میں صرف سرورق اور تصویریں چھاپی گئیں ہیں مصنف کے خیال میں اس تصنیف سے غالب اور کلام غالب پر زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں سے تبصرہ نگاری کی مثال قایم ہو گئی ہے اور بہادر شاہی دور پر جو پردے ہماری ناواقفیت سے پڑتے جا رہے تھے اُٹھ گئے ہیں۔

روح غالب — ڈاکٹر زور قادری کی تصنیف ہے جو ۱۹۳۹ء میں مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مرزا کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اُن کے ادبی کارناموں پر بھی نظر ڈالی گئی ہے اور زور صاحب کے لفظوں میں غالب کی نثر کے جو انتخابات اس کتاب میں شامل ہیں وہ ان کے اُردو مکاتیب کا نچوڑ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے غالب کی شخصیت اور ان کی قلبی، روحانی کیفیت صحیح معنوں میں بے نقاب ہو جاتی ہے۔

غالب — غلام رسول مہر طبع چہارم عالم گیر الکٹرک پریس لاہور ۱۹۴۶ء پہلی بار ۱۹۳۹ء میں جب میں لاہور گیا

تھا تو مولانا مہر نے ازراہ خلوص غالب کی جلد، جلد اس پر اپنے قلم سے کچھ لکھ کر مجھے مرحمت فرمائی تھی غالباً وہ پہلا اڈیشن تھا ایک صاحب نام لوں گا تو خفا ہو جائیں گے میرے ذخیرۂ نوادر سے اُڑا لے گئے۔ حالی کی یادگار غالب کے بعد جس غالب نے اس دور میں قبولیت و شہرت کی سند حاصل کی ہے وہ مولانا مہر کی لایق عزت تصنیف "غالب" ہے اس سے زیادہ مکمل اور قابل اعتماد کوئی دوسرا مجموعہ ابھی تک شایع نہیں ہوا۔

بیان غالب ــ دیوان غالب کی نئی شرح ہے جس کو آغا محمد باقر ام۔اے نے ۱۹۴۰ء میں عالمگیر الکٹرک پریس سے چھپوا کر شایع کیا ہے ان کے خیال میں یہ جامع شرح ہے تاکہ دیوان غالب کے طلبا کو بیک وقت مختلف شرحوں کی چھان بین سے مستغنی کر دے اس نام کی ایک کتاب مولوی مہدی صاحب رکن دارالترجمہ حیدر آباد دکن نے بھی تصنیف فرمائی تھی جس کا آخری حصہ ان کی اجازت سے رسالہ اُردو بابت ماہ اپریل ۱۹۲۱ء میں شایع ہو چکا ہے۔

خطوطِ غالب ــ مولوی مہیش پرشاد صاحب ہندو یونیورسٹی بنارس جن کے پاس اس وقت سب سے زیادہ سرمایہ غالب کا محفوظ ہے مختلف ماخذوں سے اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد نے سٹی پریس الہ آباد میں چھپوا کر شایع کی ہے اس مجموعہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مکتوب الیہ کے نام کے خطوط تاریخی ترتیب سے درج کئے گئے ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جو خطوط غالب کو عود ہندی اور اُردوئے معلیٰ کی سطح سے بلند کر دیتی ہے۔

سرگزشت غالب ــ مرزا محمد بشیر ام۔اے۔بی۔ٹی کی ہوئی ۹۷ صفحوں کی ماسٹرانہ کتاب ہے جس کے متعلق خود ماسٹر صاحب کا خیال یہ ہے کہ مرزا کی آپ بیتی خود ان کے الفاظ میں بغیر کسی حاشیہ آرائی کے اب تک کسی نے نہیں پیش کی گویا ان کی یہ کتاب اس کمی کو پوری کر رہی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں عزیزی پریس آگرہ نے چھاپی ہے۔

مکاتیب غالب ــ کتاب خانۂ ریاست رام پور کی مطبوعات کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس کو مولانا امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ نے اپنے مقدمہ و حواشی کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں مطبع قیم بمبئی میں چھپوایا ہے۔

ذکر غالب ــ مالک رام ایم۔اے بار اول ۱۹۳۸ء مطبوعہ جید برقی پریس دہلی، ذکر غالب خلاصہ ہے ان تمام سیرتوں کا جو اس وقت تک لکھی گئی ہیں۔ جدت صرف اتنی ہے کہ واقعات بہ حساب سنین ترتیب دئے گئے ہیں، جس سے پڑھنے والوں کو بہت سی آسانیاں مل جاتی ہیں۔ بعض معلومات بالکل نئی بھی ہیں جو غالب کے دوسرے اور تذکروں میں نہیں ہیں۔

درس غالب ــ مرزا کے اس دیوان کا جدید اڈیشن ہے جو ماہ مئی ۱۸۴۷ء مطبع دارالسلام دہلی حوض قاضی میں چھپا تھا۔ اس کی نقل پیرزادہ محمد حنیف اڈیٹر "درس غالب" نے اُردوئے معلیٰ اکاڈمی لاہور سے ۱۹۳۸ء میں شایع کی ہے۔

نادر خطوط غالب — مرزا کے ستائیس غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جس کو رسا ہمدانی گیاوی نے جمع کیا ہے۔ ان میں سے چار خطوط کے بلاک رسالہ ندیم گیا ۱۹۴۴ء میں شایع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء میں فاین پریس لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔

غالب — ڈاکٹر سید عبداللطیف پروفیسر جامعہ عثمانیہ کا انگریزی رسالہ ہے جس میں غالب کی شاعری کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔

غالب اور اسکی شاعری — مولوی احمد الدین احمد ماہروی بی۔ اے کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو سفیر بک ایجنسی سبزی منڈی الہ آباد سے شایع ہوا ہے۔ یہ رسالہ "حالی" و "بجنوری" کی حقیقت کوش نوائی صدائے بازگشت ہے۔

یوسف ہندی بقید فرنگ میں — محسن بن بشیر کا مرتب کیا ہوا کتابچہ ہے جو لارپورٹ مشین پریس جام باغ حیدر آباد میں چھپا ہے، اس میں بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ مرزا کی قید کے واقعے کی تحقیق کی گئی ہے۔ اس میں ترکیب بند اسیری بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے قیدیوں کی کیا حالت ہوتی تھی اور اُن کے ساتھ کیسے سلوک کئے جاتے تھے۔

مومن و غالب — مولانا سید اعجاز صاحب معجز سہسوانی کی تصنیف ہے۔ جس میں مصنف سے زیادہ تبصرہ نگار نے جن کا نام نامی، اسم گرامی یوں سپرد قلم ہو کر زیب قرطاس ہوتا ہے۔ اعجاز رقم افتخار لوح و قلم رقیقہ سنج حقایق و معانی مولانا محمد شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی غالب کو اُردو شعرا کی صف سے خارج کرنے کی جد و جہد فرمائی ہے۔ اور ہوا سے لڑائی کی ہے۔

مرزا غالب — مولانا عارف ہسوی کا رسالہ ہے۔ جس کا مطالعہ غالب شناسی کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

دیوان غالب — (فی غلطی ایک روپیہ انعام والا) آرٹ پریس امرت سر میں چھپا ہے اور جسے ہند پبلشرز میکلوروڈ لاہور کے منیجر غلام احمد نے شایع کیا ہے، شروع میں دو دیباچہ بھی ہے جو ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ کو مرزا نے اپنے پہلے اُردو دیوان کے لئے لکھا تھا۔

یادگار غالب — مسدس والے مولانا کی لایق فخر تصنیف ہے۔ جس میں مرزا کی بلند خیالی اور جدت پسندی پر جدید اسلوب تذکرہ کی روشنی میں دلچسپ بحثیں ہیں اور اُن کے کلام کی خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایوان غالب کی پہلی منزل یہیں سے شروع ہوتی ہے جس پر اس وقت تک بہت سی پائیدار و ناپائیدار منزلوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔

محاسن کلام غالب — بجنوری مرحوم کا مرزا کے کلام پر اچھوتا تبصرہ ہے جو بلند خیالی، زور بیان اور جدت فکر کے لحاظ سے اُردو زبان میں بالکل نئی چیز ہے، ۱۹۲۱ء میں رسالہ اُردو کے پہلے نمبر میں شایع ہوا تھا، اب کتابی صورت میں اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔

دیوان غالب مع شرح — نظامی بدایونی جو انھیں کے پریس کے بڑے اہتمام کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں شایع ہوا ہے، شروع میں ڈاکٹر سید محمود کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس نے دیوان اور شرح کو "خاصے" کی چیز بنا دی ہے۔

شرح دیوان غالب — حسرت موہانی۔ کئی بار چھپ چکی ہے۔ حسرت صاحب کی شرح مکتب غالب کے منتہی طلبا کے لئے بہت مفید ہے۔

شرح دیوان غالب بیخود دہلوی — آسان زبان میں مستند شرح ہے۔

مکمل شرح دیوان غالب — آسی الدنی صاحب نے لکھی ہے جو اپنے آپ کو لکھنوی بھی لکھا کرتے تھے۔ اس میں آسی صاحب نے بعض بعض شعروں کے عجیب و غریب مطالب بیان کئے ہیں جس کو پڑھنے کے بعد سخن فہمی عالم بالا معلوم کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔

شرح دیوان غالب — سہا بلند شہری مجموعی حیثیت سے اچھی شرح ہے۔

ہدیۂ سعید — قاضی سعید الدین احمد ایم۔ اے علیگ کی لکھی ہوئی شرح ہے، جو پہلی بار مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۶ء میں چھپی ہے۔ اس شرح کی خصوصیت قاضی صاحب کے لفظوں میں یہ ہے کہ "غالب پر جتنا لٹریچر کتب و رسایل وغیرہ میں دستیاب ہو سکتا ہے اس سب پر حاوی ہے"۔

رموز کلام غالب — یہ مختصر رسالہ محمد اسحاق صاحب امرتسری سابق مدیر ماہ تمام کلکتہ کی تالیف ہے جس میں غالب کے چند بہترین اشعار کی دلچسپ اور پر کیف شرح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اردو انشاد ادب میں مرزا کا کیا مرتبہ ہے، دار الاشاعت نمبر ۱۱ بٹو بازار اسٹریٹ کلکتہ نے شایع کیا ہے۔

منتخبات عود ہندی — احسن مرحوم کی مرتب کی ہوئی کتاب ہے جس میں مرزا کی سوانح حیات کے ساتھ عود ہندی کے وہ خطوط درج کئے گئے ہیں جن کے مکتوب الیہ کا نام و نشان معلوم ہے۔ عود ہندی کی غلطیوں کی طرف اشارہ اور تعریض کے باوجود "حتی الامکان" پھر بھی اس انتخابی مجموعے میں ۶ صفحوں کا غلط نامہ لگا ہوا ہے۔

گنجینۂ تحقیق — بیخود موہانی کے پانچ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا ہے۔ فاضل پروفیسر نے ان اعتراضات کے جواب دئے ہیں جو مرزا پر مختلف رسایل میں شایع ہوئے ہیں۔

فلسفۂ کلام غالب — پروفیسر سید شوکت سبزواری صاحب کی تصنیف ہے، جس کو انھوں نے بڑے شوق اور قابلیت سے مرتب کی ہے اور اپنے ممدوح مرزا نوشہ کو باقاعدہ طور پر حکیم و فلسفی ثابت کرتے ہوئے "حکمیاتی تصورات" "نظریۂ حیات" اخلاقی "قدریں" (قدریں مرزا کی زبان کا لفظ نہیں) نظریۂ حسن و عشق اور مسلک شعری وغیرہ اہم مسایل کو بھی سمجھنے، سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں "فلسفے اور تصوف" پر بھی بعض پر مغز مباحث آگئے ہیں اور بعض اشعار کی دلچسپ تشریح بھی۔ ایک جگہ حکیم و فلسفی غالب کو رومانوی شاعر بھی تسلیم کیا گیا ہے، جس کی بنیاد

بہ قول پروفیسر صاحب

"انقلاب پسندی پر ہے اور جو جوش اور جذب و مستی کے تحت پرورش پاتا ہے، غالب کا فن اور رجحان یہی انقلابی روح ہے جس نے قدیم غزل کی کہنہ حدود کو توڑ کر اُسے وسیع تر بنا دیا ہے"۔

اس دعویٰ کے ثبوت میں لایق مصنف نے دو جگہ یہ شعر نقل کیا ہے:۔

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل، کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

لیکن اس شعر کے بعد ہی اسی غزل کے سلسلے میں ایک قطعہ مدحیہ آتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر "تجمل حسین خاں" کی مدح کے واسطے وسیع تر میدان چاہتا ہے نہ کہ اصل غزل میں وسعت پیدا کرنے کے لئے۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

اسی طرح یہ شعر:۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

سبزواری صاحب کے نزدیک "زوال شوق" نہیں بلکہ "وصل" کے بعد بھی ثبات و دوام شوق کی دلیل ہے لیکن شاعر کو اگر "موج" کی تشبیہ سے جو بڑے زور، شور سے اُبھرتی ہے اور پھر سمندر میں مل کر بہ تدریج پھیل جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے "زوال شوق" دکھانا نہیں ہے تو لفظ "یوں" کے کیا معنی لگائے جائیں گے۔

سبزواری صاحب کی یہ قابل قدر تصنیف ۱۹۴۶ء میں پہلی بار قومی کتب خانہ بریلی سے شایع ہوئی ہے۔

مرزا کا ایک غیر مطبوعہ خط — اس کا بلاک لاہور اورنٹیل میگزین حصہ اول شیرانی نمبر بابت ماہ فروری ۱۹۴۷ء میں محمد داؤد رہبر نے شائع کرایا ہے۔ ابتدائی سطریں یہ ہیں: قبلہ آپ سے رخصت ہو کر بھیگتا بھاگتا بھوکا جاڑا کھاتا پرسوں گیارہ بجے دن کو اپنے گھر پہونچا۔ یہ خط ۱۱ر جنوری ۱۸۶۸ء کا لکھا ہوا ہے۔

مرزا کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط — یہ خط ۵ر جنوری ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا بلاک اطہر ہاپوڑی نے رسالہ آجکل دہلی ۱۵ر فروری ۱۹۴۷ء میں شایع کرایا ہے۔

مرزا کی سوانح حیات کا ایک ورق — جو خود مرزا نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اس کا بلاک رسالہ اُردو ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا ہے۔ ابتدائی سطریں یہ ہیں:۔

"اسد اللہ خاں غالب تخلص، قوم کا ترک سلجوقی۔ سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے، اس کا دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی آیا"۔

مرزا کے دو غیر مطبوعہ خط — ڈاکٹر سید عبداللہ لکچرار پنجاب اورنٹیل کالج نے رسالہ اُردو بابت ماہ اپریل ۱۹۴۲ء میں شائع کرائے ہیں۔ (باقی)

خیر بہوروی

بابُ المراسلۃ والمناظرہ

ماہر القادری اور پرویز کا اختلاف

فقہ و حدیث کے باب میں

پچھلے مہینے میں نے ماہر القادری صاحب مدیر فاران کے ایک مضمون کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ فقہ و حدیث کے باب میں ان کی رائے زنی بڑی غیر ماہرانہ سی بات ہے، کیونکہ ان کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فقہ و حدیث کی تاریخ سے بھی واقف نہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ میں اشاعت حاضرہ میں فقہ و حدیث کی تاریخ پیش کر کے بتاؤں گا کہ ماہر صاحب کا یہ خیال کس قدر غلط ہے کہ فقہ میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں اور احادیث سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن سے تمسک کرنا غیر اسلامی طریق کار ہے۔

فقہ اس میں شک نہیں کہ اس وقت فقہ سے مراد ایک ایسا جامع قانون ہے جو تمام مذہبی، سیاسی اور تمدنی مسایل سے تعلق رکھتا ہے، جو عبادات و معاملات دونوں پر حاوی ہے۔ اس میں مذہبی اوامر و نواہی، ترکہ و وراثت، تجارت و کاروبار، اجارہ و معاہدہ لین دین، شادی و طلاق، حقوق و مطالبات، جرائم کی نوعیت، ان کی سزا وغیرہ الغرض اس میں تمام وہ مسایل شامل ہیں جو انفرادی و اجتماعی مسایل تمدن سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ اس میں حکومت و سیاست نظم و نسق مملکت کے طریقے بھی منضبط کئے گئے ہیں، لیکن ماہر صاحب کا خیال غالباً یہ ہے کہ یہ قانون سب کا سب دفعتاً ایک ہی وقت میں مرتب ہو گیا تھا اور عہد نبوی سے لیکر اس وقت تک اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔

انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ لفظ فقہ کا مفہوم ابتدائے عہد اسلام میں محدود تھا۔ رسول اللہ کے بعد جب کوئی مسئلہ عدالت گاہ میں آتا تھا تو قرآن کو سامنے رکھا جاتا تھا اور اگر اس سے یہ مشکل حل نہ ہوتی تھی تو پھر یہ جستجو کی جاتی تھی کہ رسول اللہ اور ان کے صحابہ کے عہد میں اس کا فیصلہ کیا ہوا تھا اور اگر کوئی ایسی نظیر مل جاتی تھی تو کہا جاتا تھا کہ یہ فیصلہ بر بنائے "علم" ہوا ہے۔ لیکن اگر کسی مسئلہ میں کوئی ایسی روایت یا آثار کی نظیر نہ ملتی تھی تو پھر قاضی کو خود اپنی فراست اور ذاتی رائے سے کام لیکر فیصلہ کرنا پڑتا تھا اور اس کا نام فقہ تھا۔ اگر کوئی قاضی ایسا ہوتا تھا جو قرآن اور روایات و آثار کا عالم ہونے کے ساتھ ہی تفقہ فی الدین کی بھی اہلیت رکھتا تھا تو اس کا مرتبہ بڑا بلند سمجھا جاتا تھا۔ الغرض علم و فقہ دونوں بالکل علحدہ علحدہ چیزیں تھیں اور کوشش کی جاتی تھی کہ مقدمات کے فیصلہ میں ان دونوں سے کام لیا جائے، چنانچہ ہارون الرشید

نے اپنے گورنر ہرثمہ کو یہی ہدایت کی تھی کہ فیصلہ کے وقت وہ "الفقہ فی دین اللہ اور العلم بکتاب اللہ" کا خاص خیال رکھے پھر تابعین کے زمانہ تک تو احادیث و آثار کے عالم مل جاتے تھے، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ایسے لوگ اٹھتے گئے اور نئے نئے پیچیدہ مسایل بھی سامنے آنے لگے، اس لئے مقدمات کے فیصلہ میں زیادہ تر قیاس رائے سے کام لینا پڑا اور اسی کا نام تفقہ یا فقہ تھا۔ خود امیر معاویہ کے زمانہ میں بھی ایک بار کوئی روایتی یا آثاری نظیر نہ مل سکی تو امیر معاویہ نے زید بن ثابت سے استمزاج کیا اور جب انھیں بھی کوئی ایسی مثال نہ مل سکی تو خود اپنی رائے سے کام لیکر فیصلہ کیا، اسی طرح عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں مصر کے قاضی نے ان سے ایک خاص قانونی مسئلہ کی بابت دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "مجھے اس مسئلہ میں کوئی روایت نہیں ملی ہے، اس لئے اپنی رائے سے فیصلہ کرو"۔ الغرض عہدِ نبوی و عہد صحابہ سے جتنا زیادہ بعد ہوتا جاتا تھا، شریعت اسلامی میں روایت و آثار سے زیادہ رائے اور فقہ سے کام لیا جاتا تھا۔ یعنی فیصلہ کرنے والا خود اپنے قیاس سے کام لیکر ایک رائے قایم کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور چیز بھی تھی جسے پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ اس کا نام اجماع تھا، یعنی یہ کہ قوم کے اجتماعی نظام میں کونسی چیز ایسی ہے جس پر تمام افراد متفق ہیں۔

اجماع کا تصور مسلمانوں میں غالباً قانون رومہ سے آیا ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ جب فتوحات اسلامی وسیع ہوئیں اور وہ دوسرے ملکوں میں پہونچے تو اُن کے سامنے وہاں کے قوانین بھی آئے جو عرصہ سے وہاں رائج چلے آرہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا تھا، بلکہ ان کی اصلاح ہی ہو سکتی تھی، چنانچہ شام و عراق میں جب مسلمان پہونچے، تو وہاں پہلے ہی سے رومن قانون کا اثر قایم تھا، جس کی ایک بنیادی چیز قدیم رسم و رواج بھی تھا اور اسی سے مسلمانوں کو بھی اجماع امت کے نام سے لینا پڑا۔ اور اس طرح شریعت اسلامی کی بنیاد چار چیزوں پر قایم ہوئی:۔

(۱) قرآن۔ (۲) سنت نبوی۔ (۳) قیاس اور (۴) اجماع۔ اور اس طرح علم فقہ ایک مستقل علم بن گیا اور بڑے بڑے فقہا پیدا ہوئے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اگر کسی زمانہ کے فقیہ نے کوئی فیصلہ کسی مسئلہ میں کر دیا ہے تو بعد کو دوسرے فقیہ نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

سب سے قدیم اسلامی قانون جس کی بنیاد زیادہ تر سنت نبوی پر قایم تھی، مالک بن انس کا مرتب کیا ہوا وہ مجموعہ ہے جسے موطا کہتے ہیں اور حجاز و مدینہ میں زیادہ تر اسی پر عمل ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں دوسرے مقامات پر بھی تدوین فقہ کا کام شروع ہوا، چنانچہ شام میں عبدالرحمان الاوزاعی نے جو فقہ قایم کی اس پر اسپین کے مسلمان بھی عمل کرتے تھے عراق جو علوم و فنون کا مرکز ہوتا جاتا تھا، وہاں بھی اس طرف خاص توجہ کی گئی اور قیاس و رائے سے کام لیکر زیادہ اجتہادی رنگ اختیار کیا گیا، چنانچہ حماد ابن ابی سلیمان کا دبستان فقہ اس باب میں ایک باضابطہ ادارہ تھا جس کے ایک رکن ابوحنیفہ بھی تھے۔ ابوحنیفہ کو جو اہمیت عراقی فقہ میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور ان کے دو شاگرد ابو یوسف اور محمد کو تو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی کہ ہارون الرشید کے زمانہ میں تدوین فقہ کی خدمت ابو یوسف ہی کے سپرد کی گئی۔

خلیفہ مہدی نے یہ خدمت کشاف کے سپرد کی اور رفتہ رفتہ فقہ اسلامی نے ایک ایسے قانون کی صورت اختیار کی جو معاملات وعبادات کے علاوہ سیاسیات اور نظم ونسق مملکت پر بھی حاوی تھا، کیونکہ ضروریات وتعلقات کی وسعت نے مجبور کردیا تھا کہ تمدن انسانی کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر قانون بنایا جائے اور اس سلسلہ میں قیاس رائے سے آگے ایک قدم اور بڑھایا گیا جسے اجتہاد واستصلاح (مصلحت بینی) کہتے ہیں۔

پھر اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ متفقہ طور پر ہو رہا تھا، تو آپ غلطی پر ہیں، کیونکہ باوجود اس کے کہ جو حضرات تدوین فقہ واحکام شرعیہ کی خدمت انجام دے رہے تھے، وہ ہر لحاظ سے نہایت متدین، حد درجہ فقہ ومتقی تھے، پھر بھی بعض مسایل میں دوسرے فقہا وعلماء ان سے اختلاف کرتے تھے۔ اور حجازی وعراقی فقہ کے درمیان تو کافی خلیج حایل ہوگئی تھی، کیونکہ حجاز میں آزادی رائے کو زیادہ اچھا نہ سمجھا جاتا تھا اور عراقی فلسفہ کی بنیاد ہی اجتہاد پر قایم تھی۔ علاوہ اس کے انفرادی حیثیت سے بھی بعض لوگ فقہ کے بعض اجتہادات کو صحیح نہ سمجھتے تھے۔

ماہر القادری کی طرح اُس وقت بھی ایسے بہت سے لوگ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ قرآن واحادیث کے ہوتے ہوئے کسی کو قیاس واجتہاد کا کیا حق حاصل ہے، وہ کہتے تھے یہ کیونکر ممکن ہے کہ قرآن میں کسی ایسی بات کو چھوڑ دیا گیا ہو جو کسی نہ کسی نہج سے ہیئت اجتماعی سے تعلق رکھ سکتی ہے۔ اور اگر قرآن میں کسی ایسے امر کا ذکر نہیں ہے تو پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ حدیث سے اس کا پتہ نہ چل سکے، لیکن جب دُنیا کے واقعات وحالات سے سابقہ پڑتا تھا تو پتہ چلتا تھا کہ نہ معلوم کتنی باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں اور ان پر رائے قایم کرنے کے لئے اجتہاد سے کام لینا ضروری ہو پھر جبکہ فیصلہ ذاتی رائے پر ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ سب کو پسند نہیں آئے گا، اسی لئے فقہ اسلامی میں بکثرت ایسے مسایل پائے جاتے ہیں جن پر فقہاء کو اختلاف ہے، یہاں تک کہ روز کی معمولی باتوں پر بھی اتفاق نہیں پایا جاتا۔ اس کی ایک نہایت دلچسپ مثال سنئے:۔ ابتداء عمر کی بات ہے کہ میں کنز الدقایق (مشہور فقہی کتاب) پڑھ رہا تھا۔ مسئلہ عمو (کنوئیں کے پانی کی طہارت ونجاست کا تھا کہ اگر کنوئیں میں نجس چیز پڑ جائے تو کتنا پانی نکالنا چاہئے۔ اسی سلسلہ میں ایک خاص صورت یہ لی گئی کہ اگر کوئی جُنبی (یعنی وہ شخص جس پر نہانا فرض ہے) کسی کنوئیں میں کود پڑے تو اس آدمی اور کنوئیں کی طہارت کے متعلق کیا حکم ہے۔ یہاں اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ جُنبی جب تک نہا نہ لے پاک نہیں سمجھتا، اور اس کا کنوئیں میں کود پڑنا گویا ایک ناپاک شے کا کنوئیں میں گر جانا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہا کا اختلاف ہے، اس لئے اس کو صاحب کنز الدقایق نے جو کتاب کی جگہ معمے لکھنے کا زیادہ شایق تھا اس کو اس طرح ظاہر کیا کہ:۔

"المسئلۃ البئر مجحط"

یعنی کنوئیں کا مسئلہ "ج ۔ ح ۔ ط" ہے۔ مراد یہ کہ اس مسئلہ میں تین مختلف رائیں ہیں ایک یہ کہ کنواں اور جُنبی دونوں نجس ہیں (جسے ج سے ظاہر کیا گیا) دوسرے یہ کہ دونوں اپنے اپنے حال پر ہیں یعنی مرد ناپاک اور کنواں طاہر جسے ح سے ظاہر

کیا گیا) اور تیسری یہ کہ دونوں ظاہر ہیں (جسے ط سے ظاہر کیا گیا)۔ ان رایوں کی توجیہ بھی سن لیجئے، دونوں کو نجس بتانے والے کی دلیل یہ ہے کہ غسل جنابت کے لئے قصد و ارادہ نہانے اور اپنے آپ کو پاک کرنے کا ضروری ہے اور چونکہ کنویں کے اندر گرنے سے یہ شرط پوری نہیں ہوتی اس لئے مرد تو بدستور نجس رہا اور چونکہ ایک نجس چیز پانی میں گری تھی اس لئے کنواں بھی نجس ہوگیا۔ وہ فقیہہ جس کی رائے یہ تھی کہ دونوں اپنے اپنے حال پر ہیں اس کی توجیہ یہ ہے کہ مرد تو اس لئے ناپاک رہا کہ وہ ناپاکی دور کرنے کی نیت سے کنویں میں نہیں گرا تھا اور کنواں اس لئے پاک رہا کہ ایک جنبی کی نجاست، کوئی ایسی نجاست نہیں جو کنویں کو ناپاک کردے۔ تیسرے امام نے اپنی رائے کی صحت میں یہ دلیل پیش کی کہ غسل جنابت کے لئے نیت ضروری شرط نہیں اس لئے وہ تو پاک ہوگیا اور چونکہ اس کی نجاست کوئی مادی و عینی چیز نہیں تھی اس لئے کنواں بھی نجس نہیں ہوا۔ میں نے یہ سن کر اپنے استاد سے کہا کہ ایک چوتھی صورت اور بھی ہے، وہ یہ کہ مرد پاک اور کنواں ناپاک، لیکن افسوس ہے کہ اس کے لئے کوئی چوتھا فقیہہ پیدا نہ ہوا۔

اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ فقہ اسلامی میں کس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں، حد یہ ہے کہ ابو حنیفہ اور ان کے دونوں شاگرد امام یوسف اور امام محمد کے درمیان بھی بہت سے مسائل میں اتفاق نہیں پایا جاتا۔

ابو حنیفہ کے نزدیک اگر ایسا کپڑا پہن کر نماز پڑھی جا سکتی ہے جس پر شراب کا دھبہ پڑا ہو تو ان کے شاگردوں کے نزدیک نادرست ہے۔

فقہ اسلامی کا چار مذاہب میں تقسیم ہوجانا جنھیں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہتے ہیں، کھلا ہوا ثبوت اس اختلاف کا ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ شیعی، خارجی، وہابی، مقلد و غیر مقلد خدا جانے کتنی جماعتیں اور ہیں جن کی فقہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب سیاسی اختلاف بھی تھا، ہر حکومت اور ہر با اقتدار جماعت اپنے اپنے موافق فتویٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی تھی، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اصول فقہ میں بھی (جو تدوین فقہ کا علم ہی علیحدہ تھا) یہ مسئلہ بھی موجود ہے کہ آیا "یزید پر لعنت کرنا جایز ہے یا نہیں" جس کا تعلق سیاست سے ہے۔

تیسری صدی ہجری کے آغاز تک علم الفقہ کی دو تقسیمیں ہوگئیں ایک اصول دوسرے فروع۔ اصول میں یہ بتایا گیا کہ وضع قانون کے ذرایع کیا ہونا چاہیے، اور کن اساسی نظریوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ فروع کا تعلق زیادہ تر عملی پہلو سے تھا اور اس موضوع پر بکثرت کتابیں شایع ہوئیں، جن میں علیحدہ علیحدہ عنوانات سے مختلف مسایل پر بحث کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں مسلمان جہاں جہاں گئے اپنی شریعت ساتھ لے گئے، لیکن حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ فقہ کی اہمیت بھی گھٹتی گئی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بہت سے جرائم کی وہ سزائیں جو شریعت اسلام نے متعین کی تھیں ختم ہوگئیں چنانچہ چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا، زنا کے جرم میں سنگسار کرنا بعد کو خود اسلامی حکومتوں نے بھی گوارا نہ کیا۔

الغرض فقہ اسلامی کے متعلق کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ابتدا ہی سے کوئی منظم اور متفق علیہ چیز تھی بالکل

غلط ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ارکان نماز ایسے اہم مسئلہ کے متعلق بھی سب کا اتفاق نہ ہو سکا، اور رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ کے بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے، یہاں تک کہ آج یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ کھول کر۔

پھر جبکہ ابتداء عہد اسلام میں بھی فقہ کی یہ حالت تھی تو آج جبکہ ہزاروں نئے مسایل سامنے ہیں، کیونکر اس کو کافی سمجھا جا سکتا ہے اور اس دعویٰ کی صحت پر کس کو یقین آ سکتا ہے کہ اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص یہ مطالبہ کرتا ہے کہ شریعت اسلامی میں بھی وقت و زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل ہونا چاہئے تو اس کا مطالبہ بالکل حق بہ جانب ہے۔

حدیث اس موضوع پر میں بارہا تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں، لیکن ممکن ہے قادری صاحب کی نگاہ سے نہ گزرا ہو، اس لئے مختصراً اس کا اعادہ ضروری ہے۔

ظہور اسلام سے قبل بھی عربوں میں یہ دستور چلا آتا تھا کہ وہ اپنے باپ دادا کے حالات اور ان کے زمانہ کے روایات کو محفوظ رکھنے میں بڑا قدغن کرتے تھے۔ اور یہی وہ عادت تھی جس نے انھیں رسول اللہ کے اقوال و افعال کو محفوظ رکھنے کی طرف متوجہ کیا، لیکن اس میں وسعت پیدا ہوئی ان حالات کی بنا پر جو بعد از رحلت نبوی ظہور میں آئے۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد جب حکومت اسلام پھیلی اور مسلمانوں کا دوسری قوموں سے واسطہ پڑا جس میں موسوی، عیسوی، زردشتی، بودھ اور فلاسفہ سبھی شامل تھے تو میل جول کے سلسلہ میں بہت سی ایسی نئی باتیں سامنے آئیں، جن سے مسلمان خالی الذہن تھے اور انھیں قدم قدم پر یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوئی کہ فلاں امر میں رسول اللہ کی ہدایات کیا تھیں اور یہی وہ جستجو تھی جس نے روایت احادیث کی بنیاد ڈالی۔ پھر چونکہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی خود مسلمانوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور ہر جماعت اپنی تائید میں رسول اللہ کی حدیث پیش کرنے ہی سے کامیابی حاصل کر سکتی تھی، اس لئے دوسری قوموں سے قطع نظر خود آپس ہی کے متصادم اغراض نے نہ صرف جستجوئے حدیث بلکہ وضع احادیث کا دروازہ کھول دیا کیونکہ دو مخالف جماعتوں میں سے ہر ایک اپنی موافقت میں حدیث پیش کرتی تھی جن میں سے اگر دونوں کا نہیں تو کم از کم ایک جھوٹا ہونا ضروری تھا۔ پھر جب عہد صحابہ کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس میں حصولِ حکومت و سلطنت کے لئے رقیبانہ جد و جہد شروع ہوئی تو ان میں سے ہر ایک کو اپنی تائید میں احادیث کی ضرورت پیدا ہوئی اور اس طرح وضع حدیث کی مستقل ٹکسالیں قایم ہو گئیں، یہاں تک کہ جعلی سکہ بنانے والوں کی طرح جعلی حدیثیں وضع کرنے والے بھی امراء و خلفاء کے پاس جا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو ہمیا کر دی جائے۔

ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں لوگوں کو بڑی مشکل پڑی ہوگی کہ وہ کس حدیث کو صحیح سمجھیں اور کس کو موضوع یا جعلی

چنانچہ اس جانچ کے لئے اصول، جرح و تعدیل، وضع کئے گئے، اسماء رجال کا فن وجود میں آیا، یعنی اُصول تنقید یہ مقرر کئے گئے کہ راویوں کے ثقہ و عدم ثقہ ہونے پر غور کیا جائے، روایات کے سلسلہ کو دیکھا جائے اور اس طرح احادیث کی بہت سی قسمیں کی گئیں، جن کی تفصیل اس جگہ ضروری نہیں۔ لیکن بعد کو جب یہ طریقہ بھی زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوا اور تنقیح احادیث خاطر خواہ نہ ہو سکی، تو اصول "درایت" مقرر کئے گئے، یعنی روایت سے ہٹ کر عقل سے بھی کام لینا ضروری سمجھا گیا اور اس میں شک نہیں کہ یہی طریقہ کھوٹی اور کھری احادیث کے جانچنے کا سب سے بہتر تھا۔

اصول درایت کی رو سے یہ طے کر دیا گیا کہ اگر کوئی حدیث وقت و حال کے قرینہ کے خلاف ہو، اگر عقل و شرع کے خلاف ہو، یا رسول اللہ کے اخلاق کے منافی ہو تو اسے رد کر دینا چاہئے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس پر بہت کم عمل کیا گیا اور کتب احادیث کی تدوین زیادہ تر روایتی اصول پر ہوئی، یہاں تک کہ بخاری وغیرہ ایسی کتابوں میں بھی جن کے اجزاء کو احتراماً قرآن مجید کے اجزاء کی طرح پارہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جو درایتاً کسی طرح قابل قبول نہیں ہیں، لیکن اُن سے صرف اس لئے انکار نہیں کیا جاتا کہ وہ بخاری میں درج ہیں۔

مثلاً عزرائیل یا فرشتۂ موت کے متعلق احادیث کی اطلاعات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ عزرائیل اتنا چوڑا چکلا فرشتہ ہے کہ اگر تمام دنیا کے تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی اس کے سر پر ڈالا جائے تو ایک قطرہ بھی زمین تک نہ پہونچے۔ اس کا ایک پاؤں چوتھے یا ساتویں آسمان میں ایک نورانی تخت پر لٹکا ہوا ہے اور دوسرا اس پُل پر جو دوزخ و بہشت کے درمیان واقع ہے۔ اس کے ستر ہزار پاؤں ہیں۔

۲۔ عزرائیل کے پاس تمام انسانوں کی فہرست موجود رہتی ہے اور ہر نجات پانے والے کا نام کے ایک نورانی دایرہ ہوتا ہے اور دوزخی انسان کے نام کے گرد سیاہ حلقہ ہوتا ہے۔

۳۔ ادریس، الیاس، عیسیٰ اور خضر موت سے ناآشنا ہیں اور عزرائیل کی رسائی ان تک نہیں ہو سکی۔

۴۔ جب عزرائیل، موسیٰ کے پاس آیا تو انھوں نے ایک تھپڑ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ مجروح ہو گئی، جب فرشتہ نے خدا سے شکایت کی تو اس کو بہشت کا ایک سیب دیا گیا کہ اسے لیجا کر موسیٰ کو سنگھا دے تاکہ وہ خوشی سے جان دینے پر راضی ہو جائیں۔

کوہ قاف اور زلزلہ کے متعلق بھی احادیث کے علمی انکشافات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ قاف ایک پہاڑ ہے جو تمام روئے زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس کے اور زمین کے درمیان ایک زبردست حلقہ تاریکی کا ہے (بعض کے نزدیک نہایت متعفن و تاریک پانی) جس کو عبور کرنے کے لئے کم از کم چار مہینے چاہئے۔

۲۔ قاف سبز زمرد کا ہے اور آسمان کا نیلگوں نظر آنا اسی کے عکس کا نتیجہ ہے۔

۳۔ کوہ قاف تمام زمین کو محیط اس کے سمندروں کے اس طرح گھیرے ہوئے ہے جیسے انگوٹھی انگلی کو۔

۴۔ اگر کوہ قاف زمین کو تھامے نہ ہوتا تو زمین ہر وقت کانپتی رہتی اور کوئی شخص اس پر چل پھر نہ سکتا۔

۵۔ کوہ قاف زمین کی انتہائی حد ہے اور کسی کو نہیں معلوم اس کے بعد کیا ہے۔

۶۔ کوہ قاف کے ماوراء اور بھی زمینیں ہیں، ایک سونے کی، ستر چاندی کی، سات مشک کی اور ہر زمین دس ہزار دن کی مسافت کی ہے جہاں فرشتے ہی فرشتے رہتے ہیں۔

اب ماہر صاحب خود ہی غور کریں کہ کیا وہ ایسی احادیث کو صحیح سمجھ سکتے ہیں، جن میں اس قسم کے بیانات پائے جائیں۔ اگر نہیں تو پھر لازماً انھیں بخاری وغیرہ کی صحت سے انکار کرنا پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی تمام احادیث سرے سے حدیث ہی نہیں ہیں اور نہ رسول اللہ نے اس قسم کی مہمل باتیں کیں۔ بلکہ مسلمانوں نے بعد کو عیسائیوں، یہودیوں اور زردشتیوں وغیرہ کی روایات کو لیکر یہ تمام طومار باندھا اور ان کو موثق بنانے کے لئے رسول اللہ سے منسوب کر دیا —— اور تو اور حد یہ ہے کہ خود رسول اللہ کے اخلاق کو بھی مکروہ بنانے سے انھوں نے احتراز نہیں کیا۔ چنانچہ وہ حدیث دیکھئے جس میں رسول اللہ اور جناب عائشہ کا ایک ہی ظرف میں عریاں غسل کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف تو رسول اللہ کے نزدیک شرم وحیا کا اتنا بلند مفہوم پیش کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک بار حضرت علی کو تنہائی میں بھی ننگے نہانے سے منع کیا اور دوسری طرف یہ بیباکی و عریانی کہ خود ننگے نہا رہے ہیں اور وہ بھی تنہا نہیں بلکہ جناب عائشہ کے ساتھ! — کیا ماہر صاحب کو بھی اس روایت کے صحیح ہونے پر محض اس لئے یقین کریں گے کہ بخاری نے اس کو نقل کیا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ احادیث کے مجموعے سب کے سب ناقابل اعتبار ہیں، یقیناً ان میں بعض احادیث ایسی بھی ہیں جو واقعی رسول اللہ سے منسوب کی جا سکتی ہیں، لیکن زیادہ تر حصہ لغویات ہی کا ہے، جس کو رد کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

نفس حدیث کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا یعنی اگر روایتاً و درایتاً دونوں طرح یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں حدیث واقعی رسول اللہ کی ہے، یا آپ نے واقعی ویسا ہی فرمایا یا کیا جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر کسی قول و فعل کو رسول اللہ کی ذات گرامی سے غلط منسوب کیا جائے تو کوئی ذی فہم اس کے ماننے پر صرف اس لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ صحیح بخاری میں پائی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ درایت یا عقل سے کام لینے کا حق کس کو حاصل ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسا مشکل سوال نہیں۔ ایسی روایات جو مسلمہ تاریخی یا علمی حقایق کے خلاف ہیں، ان کے متعلق زیادہ عقل آرائی کی ضرورت نہیں، ہر شخص ان کو جانتا اور سمجھتا ہے، اسی طرح وہ روایات جو تعلیم اخلاق وغیرہ سے متعلق ہیں، ان کی بابت دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ نبی ہونے کی حیثیت سے جو اخلاق رسول اللہ کا ہو سکتا ہے یا جس اخلاق کی تعلیم آپ دے سکتے ہیں،

وہ بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس کو لوگ نہ سمجھ سکیں۔ رہ گئیں وہ روایات جن کا تعلق اسرائیلیات یا مابعد الطبیعیات سے ہے وہ البتہ جھگڑے کی چیز ہیں اور ان پر عقل سے کام لیکر رائے قایم کرنے کا حق ہر شخص کو انفرادی طور پر حاصل ہونا چاہئے اگر ماہر صاحب ان کو صحیح سمجھتے ہیں تو سمجھیں، لیکن وہ دوسرے کو ان کے صحیح باور کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے مثلاً جو احادیث دوزخ، جنت، حشر و نشر وغیرہ کے متعلق ہیں، اگر ان کو میری عقل باور نہیں کرتی تو مجھے یہ حق حاصل ہے کہ از روے درایت ان کے احادیث ہونے سے انکار کر دوں اور اس پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس پر جناب ماہر یا کوئی اور صاحب کیوں برہم ہوں اور اگر ان مسایل کو کوئی شخص صرف قرآن سے سمجھنا چاہتا ہے تو اس کو کیوں مورد الزام قرار دیا جائے۔

میں اخیر میں یہ پھر عرض کروں گا کہ مجھے معلوم نہیں پرویز صاحب (مدیر طلوع اسلام) نے کیا لکھا تھا، لیکن اگر وہ صرف تمسک بالقرآن کے قایل ہیں اور احادیث کو اہمیت نہیں دیتے، تو میرے نزدیک وہ ماہر صاحب سے زیادہ قوی جذبۂ ایمانی رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے صرف قرآن کو دلیل راہ بنایا ہے اور ماہر صاحب صرف بخاری پر ایمان رکھنے والوں میں سے ہیں۔

انھوں نے میری بابت جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی صحیح نہیں، میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ فقہ کا دفتر جلا دئے جانے کے قابل ہے، البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ اس میں حالات کے لحاظ سے تبدیلی کی ضرورت ہے، احادیث کے متعلق بیشک میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اگر تنقیح کے بعد واقعی کوئی صحیح مجموعہ احادیث کا ہمارے علماء کرام پیش نہیں کر سکتے، تو ان سے یکسر دستبرداری کر لینا چاہئے، کیونکہ اسلام کو مجموعۂ اوہام و مزخرفات بنانے کی ذمہ داری انھیں کے سر ہے۔ لیکن یہ حالات موجودہ جبکہ تمام ممالک اسلامی میں کوئی ایک بھی فقہ اسلامی یا شریعت اسلامی کا پابند نہیں ہے اور احادیث کیا قرآن کی تعلیمات کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے، نہ ہماری توقعات پوری ہو سکتی ہیں نہ ماہر صاحب کی، اس لئے میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا کہ اس زمانہ میں اس قسم کی بحث چھیڑ کر خود جماعت اسلامی میں انتشار پیدا کیا جائے خصوصیت کے ساتھ پاکستان میں جس کو ابھی بہت سی دشوار گزار منزلیں طے کرنا ہیں۔

اس طرح کے تمام مذہبی مسایل پر

اگر آپ محققانہ مضامین دیکھنا چاہتے ہیں تو اڈیٹر نگار کی حسب ذیل کتابیں مطالعہ کیجئے:۔

"من و یزداں" جلد اول قیمت تیرہ روپیہ

"من و یزداں" جلد دوم قیمت ساڑھے پانچ روپیہ

"مذہب" قیمت ایک روپیہ

منیجر نگار

مالہ وماعلیہ

ناطق لکھنوی اور تاباں قادری کی ہمطرح غزلیں

(نشاط القادری - کلکتہ)

مکرمی ومحترمی! السلام علیکم !!

تاباں القادری صاحب کلکتہ کے ایک مشہور شاعر ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے کلام میں استادانہ رنگ پایا جاتا ہے غالباً آپ نے بھی ان کی غزلیں پڑھی ہوں گی میں انھیں عزت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور یہاں کے مشاہیر شعرا خصوصاً حضرت رضا علی وحشت مدظلہ سے بھی ان کی تعریفیں سُن چکا ہوں لیکن چند نوجوان ایسے ہیں جو ان کے خلاف اکثر زہر اُگلتے رہتے ہیں اور اب تو یہاں تک کہا جارہا ہے کہ یہ استادوں کی غزلیں توڑ مروڑ کے اپنے نام سے پیش کرتے رہتے ہیں شاعر پر یہ ظلم خصوصاً مجھ سے برداشت نہیں ہوتا لہٰذا آپ کی ذات بابرکات سے اس کی داد چاہتا ہوں مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کا فیصلہ انصاف اور صداقت پر مبنی ہوگا، ہر چند میں نے تاباں القادری صاحب سے ذکر کیا تھا کہ میں نیاز صاحب سے اس ضمن میں فیصلہ طلب کرتا ہوں اور انھوں نے مجھے اس سے روکنے کی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص خود ظالم ہو وہ انصاف کیا کرے گا آپ میری غزل وہاں نہ بھیجیں اس سے قبل میں خود اپنی دو غزلیں بھیجکر آزما چکا ہوں جس پر میں نے یہ کہا تھا کہ نیاز صاحب کے متعلق آپ کا یہ فیصلہ غلط ہے یقیناً آپ کی بھیجی ہوئی غزلیں انھیں نہیں ملی ہیں ورنہ وہ ضرور شایع کر دیتے بس وہ خاموش ہوگئے اور کہا کہ خیر تم بھی آزما دیکھو اس سے ان کی نا امیدی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن میں نا امید نہیں ہوں اور مجھے کامل اعتماد ہے کہ تاباں صاحب کو اپنی رائے بدل لینی ہوگی. قصہ مختصر دو غزلیں ایک علامہ ناطق لکھنوی اور ایک موصوف کی جو ایک ہی زمین پر ہیں روانہ کر رہا ہوں، الزام یہ ہے کہ دوسری غزل پہلی غزل کا چربہ ہے، آپ برائے کرم دونوں غزلوں پر نگار میں اپنا اظہار خیال فرمائیں ممنون ہوں گا۔

علامہ ابوالعلا ناطق لکھنوی :-

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس کا درد ہے — میں سراپا دل ہوں میرا دل سراپا درد ہے
میرے چپ رہنے سے تو غافل ہے او ظاہر پرست — ظرف بھی اتنا ہی رکھتا ہوں کہ جتنا درد ہے

ہر تڑپ پر روح آجاتی ہے قالب میں نئی
مجھ مریضِ ناتواں کی جان گویا درد ہے،
بچ گئے تو انتہائے عشق میں لطف آئے گا
اور ابھی تو ابتدا میں انتہا کا درد ہے
چارہ گر، چارہ سازی سے نہ ہوگا فایدہ
ہے دوا دل کی اسی کے پاس جسکا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لینے دو ناطق سب کو تم
جانتا ہے وہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

تاباں القادری :-

اضطراب شوق کا دمساز دل کا رد ہے
بزم میں خاموش ہوں میں اور گویا درد ہے،
نقد ہستی قیمتِ دل، ہستیٔ دل نذرِ دوست
مجھ سے افضل دل ہے میرا دل سے اعلیٰ درد ہے
بہتے بہتے کشتیٔ دل آنکھ سے بہ جائے گی،
اشکِ غم جس کا کنارا ہے وہ دریا درد ہے
طول قصہ اس قدر دل ہے مرا پامالِ غم
مختصر اتنا کہ دل جس کا، اسی کا درد ہے
ان کو شکوہ ہے کہ ہم رکھتے نہیں ان کا خیال،
دل میں گنجایش نہیں اُن کی، اب اتنا درد ہے
آدمی کو جز غم و اندوہ آزادی کہاں
بیخبر دنیا میں ہستی کا مداوا درد ہے،
بارگاہِ عشق سے اب اور کیا مانگوں مراد
میں مجسم شوق ہوں اور دل سراپا درد ہے

جرأتِ فکرِ مداوا ہو تو کیونکر ہو اُسے
جانتا ہے چارہ گر تاباں یہ میرا درد ہے

(نگار) یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی کہ نگار کے ذریعہ سے جواب دیا جاتا، لیکن آپ کی خواہش یہی ہے، اسلئے تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

آپ دو باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا جناب تاباں کی غزل حضرت ناطق کی غزل کا چربا ہے (آپ ہی کے الفاظ میں) اور دوسرے یہ کہ ان غزلوں کے متعلق میری کیا رائے ہے۔

امر اول کے متعلق میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جناب ناطق کی غزل اگر پہلے کی لکھی ہوئی ہے (اور غالباً ہے بھی ایسا ہی) تو یقیناً تاباں نے اسی کو سامنے رکھ کر یہ غزل لکھی، اور اگر اس کو چربا کہہ سکتے ہیں تو یقیناً ہے، ورنہ تغزل کی حیثیت سے ناطق کی یہ غزل اتنی پاکیزہ و معیاری چیز ہے کہ تاباں کی غزل کا اس کے سامنے ذکر کرنا بالکل بے معنی سی بات ہے۔ چربا، ہو بہو نقل کو کہتے ہیں، اور تاباں کی غزل گو قافیہ ردیف اور وزن کے لحاظ سے اس کی نقل ضرور ہے

لیکن معنویت کے لحاظ سے وہ اتنی پست و ناقص ہے کہ ناطق کی غزل کے سامنے اس کا ذکر کرنا بھی انتہائے بدذوقی ہے۔ جناب ناطق کی یہ بڑی مشہور غزل ہے اور شاید اس زمانہ کی لکھی ہوئی ہے جب وہ کانپور میں تھے، جوان تھے اور محبت کے اس دور سے گزر رہے تھے جب انسان واقعی سراپا درد ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی یہ غزل بے انتہا اثر انگیز ہے اور تغزل کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ناطق صاحب کا یہ جذباتی دور زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا اور اسی کے ساتھ ان کا رنگ تغزل بھی بدل گیا۔ بہرحال میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر ناطق صاحب کے عشق ناکام کی زندگی زیادہ طویل ہوتی اور وہ اس رنگ پر قایم رہ سکتے تو اس وقت بڑے مرتبہ کے غزل گو شاعر ہوتے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد پھر میں نے ان کی کوئی غزل اس رنگ کی نہیں دیکھی (اور اگر کوئی ہے تو میں اس کے دیکھنے کا متمنی ہوں)

فنی حیثیت سے بھی یہ غزل بڑی حد تک بے عیب ہے۔ اور اگر کہیں کہیں تھوڑا سا تغیر و تبدل کر دیا جاتا تو فنی حیثیت سے بھی وہ معیاری چیز ہو جاتی۔

مطلع کے دوسرے مصرعہ میں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ "میں سراپا دل ہوں" یعنی دل کا علٰحدہ کوئی وجود نہیں ہے اور اس کے بعد ہی "میرا دل" کہکر دل کو پھر علٰحدہ چیز قرار دیتے ہیں۔ یہ بیان کا نقص ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا:-

میں سراپا دل ہوں اپنا — دل سراپا درد ہے

اس طرح مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا ایک "مسلمہ نظریہ" ہو جاتا اور اس نظریہ کی بنا پر شاعر کا یہ کہنا کہ میں "سراپا دل ہوں" گویا اپنے آپ کو سراپا درد کہنے کے مترادف ہوتا۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں جتنا سے پہلے کہ بالکل بے محل ہے۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا:-

ظرف بھی اتنا ہی میں رکھتا ہوں جتنا درد ہے

لفظ میں کے اظہار سے زیادہ زور بھی پیدا ہو جاتا اور کہ لانے کی ضرورت نہ ہوتی چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ اور کے استعمال کا کوئی موقعہ نہیں۔ اس کی جگہ گو ہونا چاہئے۔ ناطق کی یہ غزل سراپا درد بھی ہے اور سراپا مرصع بھی۔ خصوصیت کے ساتھ مقطع جو یقیناً داد سے بے نیاز ہے۔

تاباں صاحب کی غزل کے متعلق میں کیا اظہار خیال کروں جبکہ وہ سرے سے غزل ہی نہیں، (جذبات کے لحاظ سے بھی اور فنی حیثیت سے بھی) — پانچواں شعر غنیمت ہے اور ساتواں شعر بھی ایک مفہوم رکھتا ہے۔ باقی سب محض وزن کے لحاظ سے تو شعر ہیں، ورنہ یوں کچھ نہیں۔

کفن

افسر سیمابی :-

حیرت خانۂ ادراک محور ہے سرابوں کا
جہاں پچتے رہے مغموم، کجلائے ہوئے تارے
امنگوں کو جہاں احساس نے گلرنگ پایا ہے
خزاں نے پرورش کی ہے جہاں خونی بہاروں کی
جہاں آزادیوں نے زندگی کے راگ برسائے
جہاں ملتی ہے تابِ سنگ و آہن آبگینوں پر
جہاں شانِ نشیمن بجلیوں پر مسکراتی ہے
سحر کے گیت گائے ہیں جہاں مایوں اسیروں نے
جہاں چہرے خلوص و آدمیت کے گلستاں ہیں
جہاں دِل ناشناسِ مستیٔ بیدار ہوتے ہیں
جہاں رقصاں ہیں چاندی کے سبو، سونے کے پیمانے
جہاں برپا ہوئی ہے انجمن یارِ سمن بر کی
جہاں فردوس کا پیغام ہے بادِ بہاری میں
جہاں سب کی نگاہیں ماورائے عرش و کرسی ہیں
جہاں کثرت میں یکتائی کا پرچم لہلہاتا ہے
جہاں تاریک ذرّے ماہ و پروین میں بدلتے ہیں

لہو چوسا ہے تاریکی نے کتنے آفتابوں کا،
سیاہی میں وہاں گم ہو گئے کتنے قمر پارے
وہاں ذہنوں پر آسیبِ خرد کا زرد سایا ہے
وہاں خود باغباں کے دوش پر نعشیں ہیں پھولوں کی
وہاں قلب و نظر پہ بے حسی کے ناگ لہرائے
ڈبویا ہے وہاں خود ناخداؤں نے سفینوں کو
کنارے سے وہاں طوفان کی آواز آتی ہے
اندھیرے کی پرستش کی وہاں روشن ضمیروں نے
دماغوں پر وہاں نفرت کی شمعیں ظلمت افشاں ہیں
وہاں حدِ نظر تک زنگ کے انبار ہوتے ہیں
جھلکتے ہیں وہاں افلاس کے غمناک ویرانے
وہاں پر کھی گئی ہے کونپلوں پر دھار خنجر کی
وہاں کھوئے گئے کتنے ترانے آہ و زاری میں
وہاں کتنے حقایق نوحہ خوانِ کس مپرسی ہیں
وہاں انساں فریب منبر و محراب کھاتا ہے
وہاں ہر سانس میں زہراب کے چشمے اُبلتے ہیں

جہاں دیتے ہیں سورج ایک ننھی سی کرن لے کر
وہاں خود زندگی آئی ہے کافور و کفن لے کر!

تعلیم

شہزور کاشمیری :-

نگاہ و گوش و دلِ ناصبور کی تنظیم
زبانِ فطرتِ رنگیں میں ہے یہی تعلیم

اِسی کے حکم کے تابع ہیں شش جہاتِ جہاں
اسی کے زیرِ نگیں ہے یہ دہرِ ہفت اقلیم

اسی سے ہوتی ہے تعمیرِ ذہن و فکر و ضمیر
اسی کے سوز سے روشن ہے شمعِ عقلِ سلیم

اسی کلید سے بابِ خزائنِ فطرت
زمانہ بھر کے لئے کھولتا ہے عزمِ صمیم

اسی کا فیضِ عیاں ہے تفوقِ ذہنی
اسی کے قحط سے تجھ میں ہے خصلتِ تسلیم

متاعِ علم تری جُزہ خبر کچھ اور نہیں
اور اجتہاد و نظر علم کی ہے شرطِ قدیم

ترا یہ باغ کہاں مختلف ہے صحرا سے
نہ سبزہ اس میں نہ شبنم نہ گل نہ موجِ نسیم!

ہے ایک علم سے دُہری کمر غلاموں کی
اور ایک علم کے قدموں میں افسر و دیہیم

عبث شکار ہے تخمین کا تو ساحل پر
کہ صرف حصّۂ غوّاص ہے یہ دُرِّ یتیم

خدا گواہ کہ ہے نورِ علم سے عاری
یہ خانقاہ، یہ مکتب، یہ درس گاہِ حکیم

جگن ناتھ آزاد :-

سرخروئی کا ہے یہ شوق کہ دنیائے چمن
آج پھر خونِ بہاراں سے ہوئی سرخ کفن

پھر وہ آنکھوں میں لہو بن کے اُتر آئی ہے
کبھی چمکی تھی جو نظروں میں محبت کی کرن

اب تو پھولوں کا نہیں نام بھی اے اہلِ چمن
اب تو چھوڑو بھی یہ تیور کہ چمن میں باقی

موسمِ گل! تری ممنون ہے ہر شاخِ چمن
غنچہ و گل کی جگہ پھوٹ رہے ہیں شعلے

تلملا اُٹھی ہیں ارواح جل اُٹھے ہیں بدن
ترے جھونکوں کی طراوت کا سماں کیا کہئے

یہ حوادث کا نیا دور کہاں سے آیا
ہم تو سمجھے تھے کہ اب ختم ہیں ادوارِ فتن

عرشی بھوپالی :-

ان کی نظر کا کوئی اشارا ضرور ہے
دل کو شکست کھا کے جو اتنا غرور ہے،

اللہ تیرے ہاتھ ہے میرے جنوں کی شرم
اب تک تو ہاتھ دامنِ رنگیں سے دور ہے،

ان کا خیال ان کی تمنّا ہے ان کا غم
کیا کیجے عشق پھر بھی اگر ناصبور ہے

اللہ رے اعتماد کہ ان کے بغیر بھی
ہر وقت اک خمار ہے ہر دم سرور ہے،

عرشی وہ جا رہے ہیں نظر مجھ سے پھیر کر
ہر ہر قدم پہ شیشۂ دل چور چور ہے

پروفیسر شورؔ :-

سننے والا کہیں ہے کس سے کہیں افسانہ ہم
رہ کے اس محفل میں بھی محفل سے ہیں بیگانہ ہم

تیری محفل میں تجھی سے اس قدر بیگانہ ہیں
ہوش میں تو اور بھی ہو جائیں گے دیوانہ ہم

سوچ لے اے برق کچھ پایانِ گلشن سوچ لے
لے اُٹھا لیتے ہیں گلشن سے ابھی کاشانہ ہم

یہ جنوں اور اس جنوں پر چاک داماں کا خیال
کب اُٹھاتے ہیں بھلا یہ تہمتِ فرزانہ ہم

تیرے ملتے ہی زمین و آسماں گم ہو گئے
کیا بتائیں اب کہاں ہیں اے غمِ جانانہ ہم

کس سے کہتے شورؔ اپنے درد کا افسانہ آہ
بزم تھی بیگانہ ہم سے بزم سے بیگانہ ہم

سحرؔ فتحپوری :-

میں مستی میں ہستی سے غافل نہیں ہوں،
خودی کی نگہباں مری بیخودی ہے

دلِ محزوں ستم و جور سے ہارا تو نہیں
میں نے گھبرا کے تجھے چرخ پکارا تو نہیں

سوزِ پنہاں کی قسم مجھ کو سرشکِ غم پر
وہم اکثر یہ ہوا ہے کہ شرارا تو نہیں

غمِ فراق سے گھبرا نہ اے دلِ مضطر!
ٹھہر ٹھہر وہ تصور میں آئے جاتے ہیں

کسی کے عشق میں اللہ رے خوفِ رسوائی
ہزار غم ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں

یہ کون بام پہ ہے آج جلوہ گر کہ سحرؔ
ابھی سے انجمِ شب جھلملائے جاتے ہیں

دورِ جنوں گزر چکا نشۂ غم اُتر چکا
میرے ندیم! دل مگر آج بھی شاد ماں نہیں

دکھ درد کا ساتھی کوئی نہیں اے حضرتِ ناصح رہنے دو
دن رات نصیحت کرنے سے دل اور پریشاں ہوتا ہے

مطبوعات موصولہ

آثار مولانا ابوالکلام آزاد

تصنیف ہے قاضی محمد عبدالغفار صاحب کی جسکو انھوں نے ایک "نفسیاتی مطالعہ" کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اکابر کے سوانح و مشاغل کا استقصاء کرکے ان کی نفسیات کو سمجھنا بڑا اہم و مفید کام ہے لیکن اتنا ہی مشکل بھی ہے، اور ہم کو افسوس ہے کہ فاضل مصنف اس سخت منزل سے گزرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ پوری صداقت و دیانت کے ساتھ وہی شخص نفسیاتی مطالعہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے جو پیشِ نظر ہستی سے مرعوب نہ ہو اور قاضی صاحب نے اس کتاب کی نہ صرف بسم اللہ اپنے احساس نارسائی کے اعتراف سے کی ہے، بلکہ پوری کتاب اسی اعترافِ عجز کے زیر اثر لکھی گئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب نفسیاتی مطالعہ کے بجائے، صنمیات کے سلسلہ کی چیز ہو گئی ہے جس میں کسی انسان نہیں بلکہ کسی دیوتا یا امام معصوم کا ذکر کیا گیا ہے جو اول تو کوئی انسانی کمزوری رکھتا ہی نہیں اور اگر رکھتا بھی ہے تو اس کا ذکر ایمان و اعتقاد یا مصلحت کے خلاف ہے۔ انفرادی نفسیات میں زیر مطالعہ ہستی کے تمام ان خصوصیات کو سامنے رکھکر گفتگو کی جاتی ہے جو اس کی ذات و ماحول دونوں سے تعلق رکھتے ہوں اور پھر انھیں کے پیشِ نظر اس کے میلانات و رجحانات، سکے خصائص نفسی و مشاغل ذاتی و اجتماعی کا مطالعہ اسکی زندگی کی ہر ہر موڑ پر کیا جاتا ہے، لیکن قاضی صاحب نے اس کتاب میں مولانا آزاد کے تمام ادوار کو خود مولانا ہی کے مضامین یا اقوال کے اقتباسات کی روشنی میں دیکھا ہے اور خود نگار نگاری کا فرض انجام دیا نہ کسی نفسیاتی رائے زنی کا ـــ اس میں شک نہیں مولانا جی نیس ہیں لیکن کسی جی نیس کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ اسکی زندگی میں کوئی جھول ہو ہی نہیں سکتا۔ اسکی توہین ہے، جی نیس وہی شخص ہو سکتا ہے، جو اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے Abnormal ہو اور اسی لئے بسا اوقات اس کی ہستی Duel personality ہوتی ہے، لیکن قاضی صاحب نے اس اصول کو سامنے رکھ کر کوئی نقادانہ نگاہ نہیں ڈالی بلکہ اس کے برعکس اگر کوئی کمزور پہلو سامنے آیا بھی تو اسے اپنی انشاپردازی سے چھپانے کی کوشش کی ـــ اس کتاب کا پہلا حصہ ممدوح کے ابتدائی حالات تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے میں ان کے سیاسی کارنامے پیش کئے گئے ہیں، تیسرے میں ان کی صحافت و ادبیت پر گفتگو کی گئی ہے لیکن یہ سب کچھ انھوں نے مولانا آزاد ہی کے بیانات سے اخذ کیا ہے اور ایسے ہر اقتباس کے بعد اعتراف عجز میں گردن جھکا کر آگے گزر گئے ہیں ـــ قاضی صاحب بڑے اچھے انشاپرداز بہت کامیاب صحافی اور کافی وسیع المطالعہ انسان ہیں، اس لئے یہ کہنا تو صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ نفسیاتی مطالعہ کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ انھوں نے یہ کتاب اس نیت سے لکھی ہی نہیں اور چونکہ وہ بیاگرفی بھی نہ تھی اس لئے ایک خوبصورت سا نام دینے کے لئے "نفسیاتی مطالعہ" کہدیا۔ لیکن اس سے قطع نظر ادبی حیثیت سے یہ کتاب بیشک قاضی صاحب کا بڑا قابل تعریف کارنامہ ہے۔ یہ کتاب کتب پبلشرز بمبئی سے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

بیگراں مجموعہ ہے جگنناتھ آزاد کی غزلوں اور نظموں کا جسے قصر اردو۔ اردو بازار دہلی نے کافی اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا۔ یہ ضخامت

۱۶۰ صفحات - قیمت ڈھائی روپیہ، جگناتھ آزاد ان چند پھولوں میں سے ہیں جنھیں فساد کی آندھی پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان اڑا لائی اور جو اب ہمارے ملک میں مہک رہے ہیں۔ میں نے یہ تشبیہ قصداً اس لئے استعمال کی کہ آزاد کی شاعری واقعی ایک خاص مہک رکھتی ہے۔ مشام جاں تک پہونچنے والی اور قلب کی تہوں میں بس جانے والی ۔۔ آزاد کا کلام پڑھنے کے بعد سب سے پہلے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ اس کی شاعری کا مقصود صرف انسانیت پرستی ہے، اس کے پالینے کے لئے وہ بیتاب ہے۔ وہ خارجی حالات کی ترجمانی کرتا ہے لیکن خود اپنے تاثرات کو سامنے رکھ کر اور اسی لئے اس میں خاص اثر ہے وہ دنیا کا مطالعہ اس زاویہ نگاہ سے نہیں کرتا کہ قدرت کی ستم ظریفیوں کے سامنے سپر ڈال دینا پڑے، بلکہ وہ اس کی وسعت کو سمیٹ کر "ہمیں جائے من وجائے تو باشد" بنا لینا چاہتا ہے، تاکہ ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں ۔۔ آزاد کے کلام میں ہمیں کسی جگہ کوئی پست درجہ کی چیز نہیں ملتی۔ وہ ہر بات پر عام سطح سے بلند ہو کر غور کرتا ہے اور اسے ایسے انداز سے پیش کرتا ہے اس سے رجائی کیفیت ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے ۔۔ اس کا کلام دردناک نہیں بلکہ دردمندانہ ہے اس کے یہاں شور و ہنگامہ نہیں، بلکہ نرمی و سکون ہے، وہ پیشانی پر شکنیں ڈال کر شعر نہیں کہتا، وہ جلی کٹی اور طنز و تشنیع سے کام نہیں لیتا، اس کے یہاں خاص قسم کی مفکرانہ سنجیدگی ہے، غصہ و غم کو پی جانے کی کیفیت ہے اور یہ بڑی چیز ہے ۔۔ وہ نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہے اور دونوں کی فنی خصوصیات کو سامنے رکھ کر شعر کہتا ہے۔

نورالرحمان اب سے سو سال پہلے مولانا محمد نوراللہ نے اپنے پیر طریقت مولانا شاہ عبدالرحمان کے حالات و ملفوظات پر فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام انوار الرحمان تھا۔ زیر نظر کتاب اسی کتاب کا ترجمہ و تلخیص ہے اردو میں۔

مولانا شاہ عبدالرحمان (جن کا مزار لکھنؤ میں اب بھی مرجع خاص و عام ہے) اپنے وقت کے بڑے صاحب باطن بزرگ تھے اور علوم ظاہری کے بھی بڑے فاضل شخص تھے۔ اور ضرورت تھی کہ ان کے حالات و ملفوظات اردو میں بھی منتقل کئے جاتے۔

مولانا محمد نوراللہ جو اصل کتاب کے مصنف ہیں، خود بھی صاحب علم و فضل شخص تھے اس لئے انھوں نے جو حالات و ملفوظات درج کئے ہیں، وہ اس طرح کی دوسری کتابوں کی سطح سے بہت بلند ہیں ۔۔ اس کتاب میں ایک مستقل باب مسئلہ توحید پر بھی ہے جس میں کلمۂ شہادت کی تفسیر و توضیح "ہمہ اوست" اور "ہمہ از دست" کی روشنی میں بڑے دلچسپ طریقہ سے کی گئی ہے۔ مولانا شاہ عبدالرحمان کے جو حالات اس کتاب میں درج ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ذات واقعی مکارم اخلاق کا بڑا زبردست مظہر تھی اور آپ روحانی ترقی کی اس منزل کے مالک تھے، جب انسان باوجود بے ہمہ ہونے کے باہمہ نظر آنے لگتا ہے ۔۔ اس زمانہ میں جبکہ مسلمان نہایت پست اخلاقی دور سے گزر رہے ہیں، اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اردو بک ڈپو۔ بھچرایوں (مراد آباد)

نماز تقریر ہے مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور کی جو انھوں نے ۴۸ء کے سالانہ جلسہ میں کی تھی۔ اس رسالہ میں نماز کی فضیلت اور اس کے اثرات پر بحث کی گئی ہے اور نہ صرف مذہبی بلکہ تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے بھی ثابت کیا گیا ہے، انسان کی دنیوی و اخلاقی ترقیوں سے نماز کتنا گہرا تعلق حاصل ہے۔ وہ حضرات جو شعائر دینی پر عقلی حجت لانا پسند کرتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں ۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ دارالکتب اسلامیہ نمبر ۱۰ (اے کلاس) محلہ اعظم پورہ حیدرآباد دکن۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جنکے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۸۰ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ سوم چار روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی جس میں ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ ادیان کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت:-

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان ملت و علمار کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے۔ زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت:-

ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جنمیں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، نظیر، غالب، صفی، انظر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔ قیمت حصہ اول بعوض حصہ دوم للہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری، فروری ۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۲۲ء سے لیکر ۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد ولین نمبر" ہے جسمیں ایک ہمشیل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے ادبیت اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۸ء

پاکستان نمبر نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھولیں جنپر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جسمیں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے پاکستان کے اندر چھ روپیہ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اسلئے ۱۰ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

پبلشر و پرنٹر و ایڈیٹر ایس حسین (نگار پریس لکھنؤ)